Registered No. L. 4186

ذی القعدۃ ۱۳۵۸ھ — جلد ۱۵ – عدد ۵

۷۸۶

ماہ نامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن" - لاہور

مبارک پارک - پونچھ روڈ

قیمت سالانہ عہ — قیمت فی پرچہ ۵ر

رسالہ ترجمان القرآن ماہوار

مرتبہ

سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

تمام ہندوستان میں یہ اپنی نوعیت کا ایک ہی ماہوار رسالہ ہے۔ اس کا مقصد وحید اعلائے کلمۃ اللہ اور دعوت جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ دنیا میں جو افکار و تخیلات اور اصولِ تہذیب و تمدّن پھیل رہے ہیں، اُن پر قرآنی نقطۂ نظر سے تنقید کرنا اور فلسفہ و سائنس، سیاست و معیشت، تمدّن و معاشرت ہر چیز میں قرآن و سُنّت کے پیش کردہ اصولوں کی تشریح کرنا اور زمانۂ جدید کے حالات پر اِن اصُولوں کو منطبق کرنا اس رسالہ کا خاص موضوع ہے۔

یہ رسالہ امت مسلمہ کو ایک نئی زندگی کی دعوت دیتا ہے اور اسکی دعوت کا خلاصہ یہ ہے کہ:

"اپنے دل اور دماغ کو مسُلمان بناؤ۔ جاہلیت کے طریقے چھوڑ کر اسلام کی صراط مستقیم پر چلو۔ قرآن کو لے کر اُٹھو اور دُنیا میں غالب بن کر رہو۔"

یہ رسالہ سات سال سے باقاعدہ نکل رہا ہے اور ملک کے مشہور رسالوں کی صفِ اوّل میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ قیمت سالانہ پانچ روپے۔ نمونے کا پرچہ ۸/

مینجر رسالہ ترجمان القرآن لاہور

[illegible] روڈ لاہور میں طبع ہوا

فہرست مضامین

ماہ ذی القعدہ ۵۸ھ (ماہ جنوری ۴۰ء) - جلد ۱۵ - عدد ۵

باہتمام ابوالاعلیٰ مودودی پرنٹر و پبلشر گیلانی الکٹرک پریس ہسپتال روڈ لاہور

میں طبع ہو کر دفتر ترجمان القرآن واقع مبارک پارک

پونچھ روڈ لاہور سے شائع ہوا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

دُنیا کا کام ہمیشہ دو قسم کے آدمیوں سے چلتا ہے۔ ایک وہ جو حالات کو، جیسے کہ وہ فی الواقع ہیں، جوں کا توں تسلیم کرتے ہیں، اور ان کے مطابق کام کرتے ہیں۔ دوسرے وہ جو حالات کو اس نظر سے دیکھتے ہیں کہ انہیں کیا ہونا چاہیے، اور اس نقطۂ نگاہ سے وہ حاضر الوقت نظام پر تنقید کرتے ہیں۔ پہلا گروہ حال کی گاڑی کو چلاتا ہے، اور دوسرا مستقبل کی اصلاح و ترقی کے لیے راستہ صاف کرتا ہے۔ ان دونوں گروہوں میں تعاون ضروری ہے، مگر انکے تعاون کی فطری صورت یہی ہے کہ ان میں تصادم ہو۔

"کیا ہے" پر نظر رکھنے والے ہمیشہ حال پر فریفتہ ہوتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جو کچھ ہو رہا ہے خوب ہو رہا ہے اس میں کسی تنقید کی گنجائش نہیں۔ اور بالفرض اگر ہو بھی تو یہ وقت تنقید کا نہیں ہے، کیونکہ اس وقت تنقید کی جائیگی تو یہ خرابیاں پیدا ہونگی، اور فلاں فلاں مصلحتوں کو ٹھیس لگ جائیگی۔ یہ سب باتیں وہ اس لیے کرتے ہیں کہ انکی نگاہ وقتی مصالح اور فوری فوائد میں اُلجھی رہتی ہے۔ عاجلہ کی محبت انہیں اتنی فرصت ہی نہیں دیتی کہ آجلہ کی فکر کریں۔ اُنکے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو کوئی وقت بھی تنقید کے لیے موزوں نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ جس وقت جو کچھ بھی ہو رہا ہوگا خوب ہی ہو رہا ہوگا۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ وقتی مصلحتیں ٹھیس کھانے کو موجود ہونگی، ہر وقت ان مصلحتوں کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے وہ یہی کہینگے کہ ابھی تنقید کا وقت نہیں ہے، اور سچ یہ ہے کہ وہ خود کبھی نہ بتا سکینگے کہ کونسا وقت تنقید کے لیے موزوں ہے۔

لیکن جنکی نظر "کیا ہونا چاہیے" پر ہوتی ہے، وہ چونکہ حالات کو ایک دوسری ہی نگاہ سے دیکھتے

ہیں، اسلیے وہ اسی وقت کو تنقید کے لیے موزوں سمجھتے ہیں جو "اہلِ حال" کے نزدیک سخت غیر موزوں ہوتا ہے انہیں اپنا کام پرستارانِ عاجلہ کی چیخوں اور فریادوں، بلکہ گالیوں کے درمیان کرنا پڑتا ہے، کیونکہ اگر وہ ایسا نہ کریں تو اصلاح و ترقی ناممکن ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ "جو کچھ ہو رہا ہے خوب ہو رہا ہے" کی ذہنیت عام لوگوں پر مستولی ہو جانے کے بعد کسی اصلاح کی ضرورت محسوس نہیں ہو سکتی۔ خامیوں کا احساس یا تو پیدا ہی نہ ہوگا کہ انہیں دور کرنے کی طرف توجہ ہو، یا اگر تھوڑا سا احساس ابھرا بھی تو حال کے شیدائی اسے دبانے کے لیے بیسیوں قسم کی تاویلیں کرینگے، تاکہ ان خامیوں کو ناگزیر ثابت کریں اور بس چلے تو خوبیوں میں تبدیل کر دکھائیں۔

"کیا ہونا چاہیے" کے نقطۂ نظر سے جو تنقید کی جاتی ہے اسکا نتیجہ کبھی یہ نہیں ہوتا کہ حال میں جو کچھ ہو رہا ہو وہ یک لخت بند ہو جائے، اور اس وقت تک جمود و تعطل کی حالت طاری رہے جب تک کہ وہ مثالی (آئیڈیل) حالت رونما نہ ہو جائے جسے مقصود قرار دے کر ناقد تنقید کرتا ہے۔ ایسا نہ کبھی ہوا ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ فطری طور پر تنقید کا اثر ہمیشہ بتدریج ہوا کرتا ہے۔ اول اول تو اسے سخت تلخی اور ناگواری کے ساتھ دیکھا جاتا ہے، کیونکہ عام طبیعتیں نقد سے مانوس اور نسیہ سے نفور ہوتی ہیں۔ پھر ایک دور شبہات کا گذرتا ہے جس میں صداقت اور نیک نیتی کے سوا ہر ممکن چیز ناقد کی طرف منسوب کی جاتی ہے۔ اسکے بعد اگر فی الواقع تنقید میں کوئی جان ہوتی ہے اور در حقیقت حاضر الوقت نظام میں وہ خامیاں پائی جاتی ہیں جنکی نشاندھی تنقید میں کی گئی ہے، اور اگر عام لوگوں کی روح بھی حقیقت میں اسی معیار کو حق تسلیم کرتی ہے جسے مدِنظر رکھ کر ناقد نے حال پر تنقید کی ہے، تب کہیں آہستہ آہستہ لوگ اصلاح کی ضرورت محسوس کرنی شروع کرتے ہیں، اور جوں جوں اصلاح کے حق میں رائے عام تیار ہوتی جاتی ہے، وقت کی قیادت پر دباؤ بڑھتا چلا جاتا ہے حتیٰ کہ یا تو پچھلے قائدوں کو اپنی حالت اور اپنی پالیسی بدلنی پڑتی ہے، یا پھر تغیر پذیر حالات کے اقتضاء سے ایک نئی قیادت

(لیڈرشپ) خود بخود نشو و نما پاکر سامنے آجاتی ہے۔ اس عمل کے دوران میں کبھی تاریخ کی رفتار میں خلا یا شگاف واقع نہیں ہوتا کہ تعطل کی وہ حالت پیش آئے جسکی بھیانک تصویر کھینچ کھینچ کر "اہلِ حال" حضرات اصلاح و ترقی کی ہر کوشش کو قوم کے حق میں سم قاتل ثابت کیا کرتے ہیں۔

کسی حالت کو مثال یا آئیڈیل قرار دے کر اُسکے لحاظ سے حاضر پر تنقید کرنے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ہم موجودہ حالت سے دفعتہً چھلانگ لگاکر اُس مثالی حالت میں پہنچ جانا چاہتے ہیں۔ کوئی صاحب عقل آدمی ظاہر ہے کہ ایسے طفرہ کا تصور بھی نہیں کرسکتا، کیونکہ تغیر بہرحال تدریجاً ہی ہوگا۔ مگر کسی صاحب عقل آدمی سے شاید یہ توقع بھی نہیں کی جاسکتی کہ وہ جس حالت کو مثال قرار دیتا ہو اُس کے بالکل برعکس حالت کی طرف جانے پر کسی درجہ میں بھی راضی ہوجائے۔ وہ اگر ذوی العقول میں سے ہے تو اس میں کم ازکم اس بات کی طلب بلکہ تڑپ ہونی چاہیے کہ حالات کی رفتار اُسی منزل کی سمت میں ہو جسے وہ مقصود قرار دے رہا ہے، خواہ وہ ابتداءً چند قدم ہی کیوں نہ ہو۔ مثلاً اگر میرا خیال یہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے فاروقی طرز کی قیادت، سیاست اور زندگی مثال کی حیثیت رکھتی ہے، تو اسکا مطلب یہ نہیں ہے کہ اب جو مسلمانوں کا لیڈر ہو وہ فاروقِ اعظم سے کم نہ ہو اور اس کے ساتھی علی مرتضیٰ اور ابوعبیدہ بن الجراح اور عبدالرحمٰن ابنِ عوف کے مثل ہوں۔ مگر اس کا مطلب یہ بھی نہ ہونا چاہیے کہ میری آخری منزلِ مقصود تو ہو وہ مقام جس پر صحابہؓ کرام تھے اور اس منزل کی طرف جانے کے لیے میرے رہبر و رہنما ہوں وہ لوگ جو نہ اس راہ سے واقف ہیں، نہ اس کی طرف جانے کا ارادہ رکھتے ہیں، بلکہ اسکے بعین مخالف سمت میں جارہے ہیں۔

فرض کیجیے کہ میں سطح زمین سے دس ہزار فیٹ کی بلندی پر جانا چاہتا ہوں تو بہرحال میں وہی ذریعہ تلاش کرونگا جو مجھے اوپر کی طرف لے جاسکتا ہو، خواہ ابتداءً وہ مجھے دس فیٹ سے زیادہ نہ اُٹھا سکے۔ ایسا ذریعہ مجھے نہ ملیگا تو میں سطح زمین ہی پر قیام کرنا پسند کرونگا۔ لیکن اگر آپ دیکھیں کہ میں اوپر جانے کے

ارادہ سے ایک برقی جھولے میں بیٹھ کر کسی کوئلے کی کان میں اترنا شروع کر دیتا ہوں اور اس راستے سے اُس بلندی پر جانا چاہتا ہوں تو کیا آپ کو میرے فاتر العقل ہونے میں ذرا سا شبہ بھی ہو گا؟ بالکل اسی طرح آپ کو میرے فتورِ عقل میں اس وقت بھی کوئی شبہ نہ ہونا چاہیے جب آپ دیکھیں کہ میں اسلامی تہذیب کو زندہ کرنے اور فاروقی حکومت کے نصب العین تک پہنچنے کے لیے اُن لوگوں کے پیچھے چلا جا رہا ہوں جنکی عملی زندگی میں اور جنکے خیالات، نظریات، طرزِ سیاست اور رنگ قیادت میں خوردبین لگا کر بھی اسلامیت کی کوئی چھینٹ نہیں دیکھی جا سکتی، جنکا حال یہ ہے کہ چھوٹے مسائل سے لیکر بڑے سے بڑے مسائل تک کسی معاملہ میں بھی انہیں قرآن کا نقطۂ نظر نہ تو معلوم ہی ہے نہ وہ اسے تلاش کرنے کی ضرورت ہی محسوس کرتے ہیں، جنکو نورِ ہدایت صرف مغربی قوانین و دساتیر ہی میں ملتا ہے، اُسی کی طرف وہ رجوع کرتے ہیں، اور اس کے بعد اگر کوئی چیز انکی نگاہ میں قابل لحاظ ہوتی ہے تو محض وقتی سیاست کی مصلحتیں جنہیں وہ خالص مادّہ پرستانہ نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔

منزلِ مقصود وہ اور راستہ یہ! کون عقلمند یہ مان لیگا کہ اُس چیز کو مقصود قرار دینے والا انسان اس راستہ پر قدم رکھنے کا خیال بھی کر سکتا ہے؟

پشت بمنزل چلنے والا تو خیر نادان بنکر چھوٹ سکتا ہے، مگر اس شخص کا معاملہ بڑا ہی عجیب ہے جو اپنے ہی آئیڈیل سے ــــ جسکو وہ خود آئیڈیل کہتا ہو ــــ گھبرائے، اسکا نام سُن کر چیں بجبیں ہو جائے، اسکو پامال ہوتے دیکھ کر آفرین و مرحبا کے نعرے بلند کرے، اسکی حمایت کرنے والے کا منہ نوچنے کے لیے دوڑے، اور ساتھ ہی یہ بھی کہتا جائے کہ آئیڈیل تو میرا وہی ہے۔ یہ آئیڈیل کی ایک بالکل ہی نرالی قسم دریافت ہوئی ہے جس سے ہم ابھی تک آشنا نہ تھے۔ ہمیں تو یہی معلوم تھا کہ آئیڈیل انسان کی محبوب ترین چیز ہوتی ہے۔ اس کا نام سُن کر دلوں میں حرارت پیدا ہونے لگتی ہے۔ اگر آدمی اس تک پہنچنے سے

عاجز ہوتا ہے تو رنجیدہ اور غمگین ہوتا ہے۔ اگر کسی مجبوری سے اسکے خلاف چلتا ہے تو شرمندہ ہوتا ہے اور اگر کہیں اس غلط روی پر اسے ٹوک دیا جائے تو اسکی نگاہ شرم کے مارے اٹھ نہیں سکتی۔ مگر اب ہمارا تعارف اس نئی قسم کے آئیڈیل سے ہوا ہے جو ہے تو آئیڈیل ہی، لیکن اس کا نام لے دیجیے تو چہرے بگڑنے لگتے ہیں، اسکی طرف چلنے کے لیے کہیے تو شدتِ غضب سے تیوریاں چڑھ جاتی ہیں، اسکے خلاف چلنے پر ٹوکیے تو شرمندگی کے بجائے کمال دیدہ دلیری وجسارت کے ساتھ تاویلیں کی جاتی ہیں، اسکی حمایت کرنے والے سے بڑھ کر نگاہوں میں کوئی مبغوض نہیں ہوتا، اور اسے پامال کرنے والوں سے بڑھ کر کوئی محبوب نہیں ہوتا ـــــ کیسا عجیب ہے یہ آئیڈیل اور کتنے عجیب ہیں اسکے پرستار!

طرفہ تماشا یہ ہے کہ کانگریس اور اسکے نیشنلزم کی مخالفت میں تو اسلام اور اسلامی کلچر کا نام لیا جاتا ہے، اور اپنی ناموں کو نعرۂ جنگ بنا کر مسلمانوں کو اجتماع کی دعوت دی جاتی ہے۔ مگر جہاں اسلام اور اسکی کلچر کا تحفظ کرنے والے جمع ہوتے ہیں وہاں اسی اسلام کے قوانین علانیہ توڑے جاتے ہیں، اسی کلچر کو ذبح کیا جاتا ہے، اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان لوگوں کی ساری جنگ صرف اسلیے ہے کہ دوسروں کے ہاتھوں اسلامی کلچر کا جھٹکا نہ ہونے پائے بلکہ ہم خود اپنے ہاتھوں سے اسکو حلال کریں۔ وہاں "مسلمان" عورت اسی طرح تبرج جاہلیت کے ساتھ شمع انجمن بنی نظر آتی ہے جس طرح کوئی شریمتی جی یا کوئی میم صاحبہ ہو سکتی ہیں۔ وہاں عین نماز کے وقت جلسے ہوتے رہتے ہیں اور اگر بادلِ ناخواستہ ملتوی کیے بھی جاتے ہیں تو پیشواؤں سے لیکر پیروؤں تک شاذونادر ہی کوئی نماز کے لیے اٹھتا ہے۔ وہاں لباسوں میں، نشست وبرخاست میں، دعوتوں اور پارٹیوں میں اسلامی کلچر کا کہیں نام ونشان تک نظر نہیں آتا، اور ایک معمولی مسلمان ان حامیان اسلام اور محافظین تہذیب اسلامی کی صحبت میں پہنچ کر اپنے آپ کو اتنا ہی اجنبی محسوس کرتا ہے جتنا ہندوؤں اور پارسیوں کی کسی محفل میں کر سکتا ہے۔ وہاں کے

مباحث آپ گھنٹوں سنتے رہیں مگر بھولے سے بھی کہیں قرآن وحدیث کا ذکر نہ آئیگا، کسی مسئلے کا حل دریافت کرنے کے لیے اللہ اور اسکے رسول کی طرف رجوع نہ کیا جائیگا، بلکہ اگر قرآن وسنت کا نقطۂ نظر صریح طور پر ان کے سامنے رکھ دیا جائے تب بھی بلا تکلف اسکے خلاف طرزِ عمل اختیار کیا جائیگا۔ ان کی کمیٹیوں اور ان کے جلسوں میں آپ مسلمان کا ذکر کبھی اس حیثیت سے نہ سُنینگے کہ اس کا کوئی جماعتی نصب العین بھی ہے، وہ دنیا میں کوئی اخلاقی منصب بھی رکھتا ہے، اور کوئی الٰہی مشن بھی اس کے سپرد کیا گیا ہے۔ ان باتوں کے بجائے وہاں ساری گفتگو صرف اس حیثیت سے ہوگی کہ مسلمان کے نام سے جو ایک مجموعۂ افراد پایا جاتا ہے اسکو دنیوی نقصانات سے کس طرح بچایا جائے اور دنیوی فوائد سے کس طرح متمتع کیا جائے۔ پھر وہ لوگ جو اس طائفہ کے سرخیل ہیں ان کا حال کیا ہے؟ ان کا زعیم اکبر آٹھ کروڑ مسلمانوں کے نمائندے کی حیثیت سے رمضان کے زمانہ میں پنڈت نہرو کے ساتھ لنچ کھاتا ہے اور روائسریگل لاج سے سگرٹ پیتا ہوا نکلتا ہے۔ انکی ورکنگ کمیٹی کا ایک ذمہ دار رکن علانیہ کہتا ہے کہ جنگ میں انگریزوں کی مدد نہ کرنا خدا سے غداری ہے۔ ان میں سے اکثر کے گھروں میں آپ جائیے تو آپ کو نماز کے وقت کوئی یہ بتانے والا نہ ملیگا کہ سمت قبلہ کدھر ہے، اور اسباب عیش وعشرت سے بھری ہوئی کوٹھیوں میں سے ایک جانماز بھی فراہم نہ ہو سکے گی۔ پوری ورکنگ کمیٹی کو بٹھا کر اسلام کے بنیادی اور ابتدائی مسائل کے متعلق امتحان لیجیے تو شائد کوئی صاحب دو فی صدی سے زیادہ نمبر نہ لے سکینگے، الا ماشاء اللہ۔

کیا وہ اسلامی کلچر جسے کانگریس اور اسکی تحریک وطنیت سے بچانے کا دعویٰ کیا جاتا ہے، یہی ہے؟ اور یہی اسکے تحفظ اور احیاء کے ڈھنگ ہیں؟ اور انہی طریقوں سے، ایسے ہی رہنماؤں کی قیادت میں اُس حکومت الٰہیہ تک پہنچا جائیگا جسے منتہائے نظر اور نصب العین قرار دیا جاتا ہے؟ —— یہ سوال اتنا خطرناک ہے کہ اسے زبان پر لانا اپنی شامت کو خود دعوت دینا ہے۔ آپ کی زبان سے

اسلام اور اسکی کلچر کا ذکر سنتے ہی ہر طرف سے شور برپا ہوگا کہ یہ کیا صدائے بے ہنگام بلند کرنی شروع کردی؟ آخر اس ذکر کا یہ کونسا موقع تھا؟ دیکھتے نہیں ہو کہ ابھی ہم کلچر کی حفاظت کے لیے جمع ہو رہے ہیں۔ بھلا جمع ہونے کے دوران میں بھی کہیں کلچر کا تحفظ کیا جاتا ہوگا؟

یہی دورنگی اور گندم نمائی وجوفروشی ہے جسے دیکھ کر غیروں کو یہ کہنے کا موقع ملتا ہے کہ اصل سوال محض معاشی وسیاسی ہے اور تہذیب و مذہب کو محض عام مسلمانوں کے جذبات برانگیختہ کرنے کے لیے بہانہ بنالیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان حرکات کو دیکھ کر کون سمجھے گا کہ اپنے دین اور کلچر کی حمیت میں آپ واقعی مخلص ہیں۔ زبان سے کہیے کہ دل میں درد ہے اگر ہاتھ سے بار بار پیٹ ہی کو کھینچے جایئے تو دیکھنے والا یہی خیال کریگا کہ درد آپ کے پیٹ میں ہے نہ کہ دل میں۔ ایسی ہی باتوں سے ایک قوم کی ہوا اکھڑتی ہے اور دوسری قوموں کے دل سے اس کا رعب اُٹھ جاتا ہے۔

تفرقہ و انتشار اور بے نظمی کے تلخ نتائج دیکھ کر مسلمانوں میں اجتماع و تنظیم اور مرکزیت کی ضرورت کا احساس تو پیدا ہوا، مگر افسوس کہ عقل وخرد کی کمی نے اس مفید احساس کو بھی غلط راستہ پر لگا دیا۔ عام طور پر لوگ اب اس غلط فہمی میں مبتلا ہوتے جا رہے ہیں کہ اجتماع اور تنظیم اور مرکزیت بجائے خود رحمت ہیں لہٰذا جو مرکز بھی سامنے آئے اسکے گرد جمع ہو جاؤ اور سب مل کر چلو، انشاء اللہ کہیں نہ کہیں پہنچ ہی جاؤ گے۔ گویا جس طرح کبھی یہ خبط پیدا ہوا تھا کہ "آرٹ محض آرٹ کی خاطر" اور "ادب محض ادب کے لیے"، اسی طرح اب یہ ایک نیا خبط پیدا ہو رہا ہے کہ "اجتماع بس اجتماع کی خاطر"، اور "تنظیم محض بغرض تنظیم"، اور "مرکزیت صرف مرکزیت کے لیے"۔ حالانکہ ان چیزوں کے مفید ہونے کا تمام تر انحصار اجتماع کی روح اور تنظیم کے اصولوں اور مرکز کی نوعیت پر ہے۔ کسی غلط مرکز کے گرد بے مقصد جمع ہو جانا، یا غلط مقصد کے لیے جمع ہونا بجائے مفید ہونے کے الٹا مضر ہو جاتا ہے۔

مسلمانوں کو خوب اچھی طرح سوچ سمجھ کر سب سے پہلے یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ آخر ان کا مطمح نظر کیا ہے اور وہ کس غرض کے لیے اجتماع اور تنظیم چاہتے ہیں۔

اگر آپ اصلی معنوں میں ایک ایسی مسلم جماعت کی تنظیم چاہتے ہیں جو اسلام اور اسکی تہذیب کا تحفظ کرسکتی ہو اور بالآخر اسلامی حکومت کی منزل تک پہنچ سکتی ہو، تو آپ کو جان لینا چاہیے کہ جو صورت تنظیم اس وقت بن رہی ہے وہ بالکل غلط ہے۔ اِس تنظیم میں جو لوگ سب سے آگے کی صف میں نظر آتے ہیں، اسلامی جماعت میں ان کا صحیح مقام سب سے پیچھے کی صف ہے، بلکہ بعض تو وہاں بھی برعایت ہی جگہ پا سکتے ہیں۔ اس قسم کے لوگوں کو پیشوا بنانا بالکل ایسا ہی ہے جیسے ریل کے سب سے پچھلے ڈبے کو انجن کی جگہ لگا دینا۔ جس چڑھائی پر آپ جانا چاہتے ہیں، یہ نام نہاد انجن آپ کی گاڑی کو اس طرف ایک انچ بھی لے کر نہیں چل سکتا، البتہ گاڑی اپنے وزن سے آپ ہی آپ نشیب کی طرف لڑھکے گی اور آپ لوگ کچھ مدت تک اس غلط فہمی میں مبتلا رہینگے کہ ماشاء اللہ ہمارا "انجن" اسے خوب اڑائے لیے جا رہا ہے۔ اس حقیقت کو جتنے جلدی سمجھ لیا جائے اتنا ہی بہتر ہے، کیونکہ ہر لمحہ جو گذر رہا ہے وہ آپ کو اوپر کے بجائے نیچے کی طرف لے جا رہا ہے۔ جو لوگ آپ کی تہذیب کو جانتے ہی نہیں وہ اس کا تحفظ کیا کرینگے؟ جو اس سے علانیہ برسر بغاوت ہیں کس طرح امید کی جاسکتی ہے کہ ان کے ہاتھوں سے اس کا احیاء اور ارتقاء ہو سکے گا؟ وہ اپنی زبان سے کلچر کلچر ضرور پکارتے ہیں، لیکن اگر حقیقت میں کلچر ہی کا درد ان کے دل میں اٹھا ہوتا تو یقیناً ان کی زندگیاں بدل گئی ہوتیں، انکی ذہنیتیں بدل گئی ہوتیں، اور ان کا طرزِ فکر بدل گیا ہوتا۔ تحریک خلافت کے زمانہ میں جب واقعی اسلامی جذبہ مشتعل ہوا تھا تو آپ نے یہ سب کچھ آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔ آج وہ چیز ناپید ہے، اور یہ اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ اس گروہ میں حقیقی اسلامی

جذبہ ہرگز مشتعل نہیں ہوا ہے۔

اور اگر اسلامی نصب العین آپ کے سامنے نہیں ہے بلکہ محض سادہ معنی میں ایک قوم کی حیثیت سے آپ اپنی انفرادیت کا تحفظ چاہتے ہیں، اور اپنے اندر نیشنلزم کی روح پیدا کر کے دوسری قوموں کے ساتھ کامیاب مسابقت کرنا آپ کا آخری مطمح نظر ہے، تو بلاشبہ آپکو اپنے پیشواؤں میں اسلام کا رنگ دیکھنے کی ضرورت نہیں، مگر کم ازکم آپ کو یہ تو دیکھنا پڑیگا کہ ان میں قوم پرستانہ ایثار، جرأت وبسالت، اور تدبر وحکمت بھی ہے یا نہیں۔ یہ صفات آپ کو اپنے ان لیڈروں میں کہاں نظر آتی ہیں؟ سروں اور خان بہادروں اور نوابوں کے اس مجمع میں کون ایسا ہے جس نے اپنی قوم کے لیے کبھی اپنا بال بھی بیکا ہونے دیا؟ ان میں کون جنگ کا مرد میدان ہے؟ کس کو آپ اُس قوم کے لیڈروں کی ٹکر کا سمجھتے ہیں جس سے آپ مسابقت کرنے جارہے ہیں؟ ان کے تدبر کا دیوالیہ پن تو اسی سے ظاہر ہے کہ تین سال سے لڑ رہے ہیں اور آج تک یہ طے نہ کر سکے کہ ہمیں چاہنا کیا چاہیے۔ کمیٹیوں پر کمیٹیاں بیٹھتی ہیں اور مطلوب کا تعین کیے بغیر اٹھ جاتی ہیں۔ گویا لڑائی تو جاری ہے مگر یہ ابھی تصفیہ طلب ہے کہ وہ چیز کیا ہو جس کے لیے ہم لڑیں! پھر سیاسی جنگ کے فن سے ناآشنائی کا حال یہ ہے کہ تین سال کی مدت میں کوئی ایک کارگر حربہ بھی انہیں نہ مل سکا۔ جب ملتے ہیں اوچھے ہتھیار ہی ملتے ہیں، جیسے یوم نجات، یا رائل کمیشن، یا وفد لندن! کیا یہ تیسرے درجہ کی قیادت آپ کو کانگریس کے مقابلہ میں فتح وظفر سے ہم آغوش کرا سکتی ہے؟

بعض لوگ مجھ سے کہتے ہیں کہ تم باہر سے تنقید کرنے کے بجائے اندر جا کر اصلاح کیوں نہیں کرتے؟ یہ اعتراض بظاہر بڑا معقول معلوم ہوتا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ معترضین کے سامنے

معاملہ کے تمام پہلو نہیں ہیں۔ میرے سب سے الگ رہنے کی اولین وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی جتنی مختلف جماعتیں اس وقت مختلف راستوں میں دوڑ دھوپ کر رہی ہیں، مجھے ان سب کے مسلک میں بنیادی نقائص نظر آتے ہیں، اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر تنقید صحیح کے ذریعہ سے ان جماعتوں کے ذی فہم لوگوں میں ان نقائص کا احساس پیدا کر دیا جائے تو یہ سب ایک جماعتی نصب العین پر مجتمع ہو سکتے ہیں۔ اسی غرض سے میں نے کامل غیر جانبداری اختیار کر کے ہر ایک پر آزادانہ تنقید کی ہے۔ اگر میں کسی ایک جماعت کا آدمی بنکر دوسروں پر تنقید کروں تو وہ کبھی نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ جو شخص ایمانداری کے ساتھ کسی جماعت میں اصولی خرابیاں پاتا ہو اس کے لیے جماعتی نظام کے اندر داخل ہونے کا کوئی موقع نہیں ہے۔ اس کا ضمیر کس طرح ایسے کُل کا جزو بننا قبول کر سکتا ہے جس کو وہ بحیثیت مجموعی غلط سمجھتا ہو؟ تیسری وجہ یہ ہے کہ جس شخص کو اپنے ہم خیال بہت کم نظر آتے ہوں اس کے لیے باہر سے تنقید کرنا زیادہ مفید ہے، کیونکہ اس طرح وہ اپنے خیالات کی تبلیغ وسیع پیمانہ پر کر سکے گا۔ جماعتی نظام کا پابند ہو جانے کے بعد اسے باہر اپنی زبان بند کرنی پڑے گی، اور اندر انقلاب پیدا کرنا بہت دیر طلب کام ہوگا۔ چوتھی وجہ یہ ہے کہ اندر سے اصلاح کرنا صرف اس جماعت میں ممکن ہے جو بالکل جمہوری اصولوں پر بنی ہو۔ لیکن جس جماعت کا دستور اس ہوشیاری کے ساتھ بنایا گیا ہو کہ ظاہر میں تو جمہوریت کی نمائش ہو اور باطن میں قدم قدم پر ارباب اقتدار نے اپنی پوزیشن کی حفاظت کے لیے مورچے بنا رکھے ہوں، اُس کا صحیح علاج باہر ہی سے ہو سکتا ہے۔ اندر جا کر لڑنا اپنی قوتوں کو ضائع کرنا ہے۔

بعض حضرات اس قسم کے غیر اسلامی اجتماع اور مرکزیت کے حق میں قرآن و حدیث سے

اس طرح استدلال کرتے ہیں کہ گویا یہی وہ "جماعت" ہے جس کے التزام کا حکم دیا گیا ہے اور جس سے الگ ہونے یا الگ رہنے پر جہنم کی وعید سنائی گئی ہے۔ لیکن میں حیران ہوں کہ اسے ناواقفیت کا کرشمہ سمجھا جائے یا خدا اور رسول کے مقابلہ میں جسارت۔ قرآن تو اُس مسجد تک میں کھڑے ہونے کی اجازت نہیں دیتا جسکی بنیاد تقویٰ پر نہ ہو۔ اور یہاں تقویٰ کا نام لینے والے خبطی سمجھے جاتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ "اللہ کی رسی" کو سب مل کر مضبوط تھامو۔ اور یہاں کہا جارہا ہے کہ بس سب لوگوں کا متفق ہو کر کسی رسی کو تھام لینا ہی ذریعہ نجات ہے، قطع نظر اس سے کہ وہ اللہ کی رسی ہو یا نہ ہو۔ قرآن صاف کہتا ہے کہ

اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُولُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رَاكِعُوْنَ (المائدہ)

مسلمانو! تمہارے حقیقی دوست اور ساتھی صرف اللہ اور رسول اللہ اور وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے ہیں، جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں، اور جو خدا کے آگے جھکنے والے ہیں۔

بلکہ یہاں تک کہتا ہے کہ

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِى الدِّيْنِ (التوبہ - ۲)

پس اگر وہ توبہ کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تب وہ تمہارے دینی بھائی ہیں۔

مگر یہاں نماز اور زکوٰۃ کی شرط کو محض بے معنی سمجھا جاتا ہے۔ برادری اور ولایت تو درکنار، امامت اور سرداری تک کے لیے یہ چیزیں شرط نہیں ہیں۔ بلکہ خدا کی مقرر کی ہوئی ان شرطوں کا نام لے لیجیے تو تیوریوں پر بل پڑ جاتے ہیں۔

احادیث میں التزام جماعت، اور اطاعت امام کے متعلق جو احکام ہیں، اور من شذ شذ فی النار اور اسی قسم کی جو وعیدیں جماعت اور امام سے الگ ہونے والوں کو سنائی گئی

ہیں، انہیں کوئی واسطہ اُن جماعتوں اور اُن امامتوں سے نہیں ہے جو محض قوم پرستی کے اصول پر دنیوی اغراض کے لیے بنی ہوں۔ وہاں تو التزام جماعت سے مراد دراصل اُس جماعت کا التزام ہے جو دنیوی اغراض سے پاک ہو کر خالصتہً لوجہ اللہ اسلام کے مشن کی خدمت کے لیے بنی ہو۔ ایسی جماعت سے الگ ہونے کا نتیجہ یقیناً نارِ جہنم ہے اور ہونا چاہیے مگر ان ہدایات کو دنیوی جتھہ بندی اور سیاسی پارٹیوں کی وفاداری کے لیے دلیل بنانا خدا کے رسول پر بہتان گھڑنا ہے۔ کسی قوم کو کسی دوسری قوم کے مقابلہ میں اگر اپنی معاشی یا سیاسی اغراض کے لیے جدوجہد کرنی ہو تو وہ عام قوانین طبیعی کے مطابق اپنا جتھہ بنائے اور قوت فراہم کرنے کی کوشش کرے۔ اسے خدا کو بیچ میں لانے کا کیا حق ہے؟ دو قوموں کی خالص نفسانی کشمکش میں آخر خدا کو جانب دار بننے کی کیا حاجت پیش آئی ہے کہ ایک کی جتھہ بندی سے الگ ہونے والوں کو تو وہ جہنم کی سزا نہ دے اور دوسری کے جتھے کو تقویت پہنچانے کے لیے وہ ہر اس شخص کے سامنے جہنم پیش کر دے جو اس سے الگ ہو یا الگ رہے؟

مقالات

عباداتِ اسلامی پر ایک تحقیقی نظر

(۲)

۱- نماز

سبحانك اللّٰھم وبحمدك وتبارك اسمك وتعالیٰ جدُّك ولا اله غیرك "پاک ہے تو اے خدا۔ تعریف وستائش ہے تیرے لیے۔ برکت والا ہے تیرا نام۔ سب سے بلند و بالا ہے تیری بزرگی۔ اور کوئی معبود نہیں تیرے سوا"

اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم "خدا کی پناہ مانگتا ہوں میں شیطان مردود کی دراندازی و شرارت سے"

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم "شروع کرتا ہوں میں اللہ کے نام سے جو رحمٰن و رحیم ہے"

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ "تعریف خدا کے لیے ہے جو سارے جہان والوں کا رب ہے"۔ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ "نہایت رحمت والا اور بڑا مہربان ہے"۔ مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ "روزِ جزا کا حاکم ہے"۔ اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ "مالک! ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں"۔ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ "ہم کو سیدھا راستہ دکھا"۔ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ "راستہ ان لوگوں کا جن پر تو نے فضل و انعام فرمایا ہے"۔ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ "ان لوگوں کا راستہ نہیں جن پر تیرا غضب ہوا ہے۔ اور نہ اُن کا جو راہِ راست سے بھٹکے ہوئے ہیں"۔ آمین "خدایا ایسا ہی ہو۔ مالک! ہماری اس دعا کو قبول کر"۔

اس کے بعد تم قرآن کی کچھ آیتیں پڑھتے ہو جن میں سے ہر ایک میں اسلام کے اساسی اصول، اُسکی اخلاقی تعلیمات، اسکی عملی ہدایات بیان کی گئی ہیں، اور اُس راہ راست کے نشانات دکھائے گئے ہیں جسکی طرف رہنمائی کی درخواست ابھی اِس سے پہلے تم نے کی ہے۔ مثلاً :-

وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِی خُسْرٍ " زمانہ کی قسم (یعنی زمانہ اس بات پر گواہ ہے) کہ آدمی نقصان میں ہے"۔ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ " سوائے اُن لوگوں کے جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے"۔ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ " اور جو ایک دوسرے کو حق پر چلنے اور اس پر ثابت قدم رہنے کی تلقین کرتے رہے"۔ ان مختصر جملوں میں انسان کو یہ بتایا گیا ہے کہ تو بربادی و نامرادی سے بچ نہیں سکتا جب تک کہ خدا پرستی و نیک عملی اختیار نہ کرے اور صرف انفرادی نیکی ہی کافی نہیں ہے، بلکہ تیری فلاح کے لیے ناگزیر ہے کہ تیری سوسائیٹی ایسی ہو جس میں حق پرستی کی روح کارفرما ہو۔ تیری اپنی تاریخ اس حقیقت پر گواہی دے رہی ہے۔

یا مثلاً اَرَاَیْتَ الَّذِی یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ " تو نے دیکھا اُس شخص کو جو روز جزا کو نہیں مانتا وہ کیسا آدمی ہوتا ہے؟" فَذٰلِكَ الَّذِی یَدُعُّ الْیَتِیْمَ " ایسا ہی آدمی یتیم کو دھتکارتا ہے"۔ وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ " اور مسکین کو آپ کھانا کھلانا تو درکنار، دوسروں سے بھی یہ کہنا پسند نہیں کرتا کہ غریب کو کھلادو"۔ فَوَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ الَّذِیْنَ هُمْ عَنْ صَلٰوتِهِمْ سَاهُوْنَ الَّذِیْنَ هُمْ یُرَآءُوْنَ وَیَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ " پھر افسوس ہے اُن نمازیوں پر جو (آخرت کو نہ ماننے ہی کی وجہ سے) نماز سے غفلت کرتے ہیں، اور پڑھتے بھی ہیں تو محض لوگوں کو دکھانے کے لیے۔ اور ان کے دل ایسے چھوٹے ہوتے ہیں کہ ذرا ذرا سی چیزیں حاجت مندوں کو دیتے ہوئے بھی ان کا دل دُکھتا ہے"۔ ان چھوٹے چھوٹے پُر اثر فقروں میں یہ بات ذہن نشین کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ آخرت کا اعتقاد آدمی کی اخلاقی زندگی میں کیا اثر رکھتا ہے، اور اس عقیدہ پر ایمان نہ ہونے کی وجہ سے آدمی کا اجتماعی برتاؤ اور انفرادی رویہ کس طرح خلوص

اور ہمدردی سے خالی ہو جاتا ہے۔

یا مثلاً وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ "افسوس ہے ہر اُس شخص کے حال پر جو دوسروں کی عیب چینی کرتا اور آوازے کستا پھرتا ہے"۔ الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُ "روپیہ جمع کرتا اور گن گن کر رکھتا ہے"۔ يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ "وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال ہمیشہ اس کا ساتھ دیگا"۔ كَلَّا لَيُنْبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ "ہرگز نہیں! ایک دن آنے والا ہے جب وہ یقیناً حطمہ میں ڈالا جائیگا"۔ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْحُطَمَةُ "اور تجھے کیا خبر حطمہ کیا چیز ہے"۔ نَارُ اللَّهِ الْمُوقَدَةُ الَّتِي تَطَّلِعُ عَلَى الْأَفْئِدَةِ "اللہ کی بھڑکائی ہوئی آگ، جس کی لپٹیں دلوں پر چھا جائینگی"۔ إِنَّهَا عَلَيْهِم مُّؤْصَدَةٌ فِي عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ "وہ اونچے اونچے ستون جیسے شعلوں کی صورت میں ان کو گھیر لے گی"۔

یہ محض دو تین نمونے ہیں جن سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہر نماز میں قرآن کا کوئی نہ کوئی حصہ پڑھنا کس لیے لازم کیا گیا ہے۔ اس سے غرض یہی ہے کہ روزانہ کئی کئی وقت خدا کے احکام، اسکی ہدایات اور اسکی تعلیمات بار بار آدمی کو یاد دلائی جاتی رہیں۔ یہ دنیا، یہ دار العمل جس میں کام کرنے کے لیے انسان بھیجا گیا ہے، اسی طرح درست رہ سکتی ہے کہ اِس کے اندر کام کرنے کے دوران میں آدمی کو تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد الگ بلایا جاتا رہے تاکہ یہاں جس قانون اور جس ہدایت نامے Instrument of instructions) کے مطابق اسے کام کرنا ہے، اسکی دفعات اِسکی یاد میں تازہ ہوتی رہیں۔

ان ہدایتوں کو پڑھنے کے بعد تم اللہ اکبر کہتے ہوئے رکوع میں جاتے ہو، گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اپنے بادشاہ کے آگے جھکتے ہو اور بار بار کہتے ہو سبحان ربی العظیم "پاک ہے میرا رب جو بڑا بزرگ ہے"۔ پھر سیدھے کھڑے ہو جاتے ہو اور کہتے ہو سمع اللہ لمن حمدہ "اللہ نے سن لی اُس شخص کی بات جس نے اسکی تعریف بیان کی"۔ پھر اللہ اکبر کہتے ہوئے سجدے میں گر جاتے ہو اور بار بار کہتے ہو سبحان ربی الاعلیٰ "پاک ہے میرا پروردگار جو سب سے بالا و برتر ہے"۔ پھر اللہ اکبر کہہ کر سر اٹھاتے ہو، ادب سے بیٹھ جاتے ہو اور یہ

الفاظ زبان سے ادا کرتے ہو:

التحیات للہ والصلوات والطیبات "ہماری سلامیاں، ہماری نمازیں اور ہمارے تمام اچھے کام اللہ کے لیے ہیں" السلام علیك ایھا النبی ورحمۃ اللہ وبرکاتہ "سلام ہو آپ پر اے نبی، اللہ کی رحمت اور اسکی برکتیں آپ پر نازل ہوں"۔ السلام علینا وعلی عباد اللہ الصّٰلحین "سلامتی ہو ہم پر اور اللہ کے سب نیک بندوں پر" اشھد ان لا الٰہ الا اللہ واشھد ان محمداً عبدہ ورسولہٗ "میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ اللہ کے بندے اور رسول ہیں" ـــــ یہ شہادت دیتے وقت سیدھے ہاتھ کی پہلی انگلی اٹھائی جاتی ہے، کیونکہ یہ نماز میں مسلمان کے عقیدے کا اعلان (declaration) ہے اور اس کو زبان سے ادا کرتے وقت خاص طور پر توجہ اور زور دینے کی ضرورت ہے ـــــ اللھم صلّ علی محمد وعلی اٰل محمد کما صلیت علی ابراھیم وعلی اٰل ابراھیم انك حمید مجید "خدایا رحمت فرما محمدؐ اور آل محمدؐ پر جس طرح تو نے رحمت فرمائی ابراہیمؑ پر اور آل ابراہیمؑ پر" اللھم انی اعوذ بك من عذاب جھنم واعوذ بك من عذاب القبر واعوذ بك من فتنۃ المسیح الدجال واعوذ بك من فتنۃ المحیا وفتنۃ الممات واعوذ بك من المأثم والمغرم۔ "خدایا تیری پناہ مانگتا ہوں دوزخ کے عذاب سے، اور تیری پناہ مانگتا ہوں قبر کے عذاب سے، اور تیری پناہ مانگتا ہوں دجّال کے فتنہ سے، اور تیری پناہ مانگتا ہوں زندگی اور موت کے فتنہ سے، اور تیری پناہ مانگتا ہوں برے اعمال سے اور دوسروں کے حقوق کی ذمہ داری سے"

یہ ہیں وہ عبارتیں جو رات دن کی پانچوں نمازوں میں تنکرار کئی کئی مرتبہ دُھرائی جاتی ہیں۔ مگر رات کو سونے سے پہلے سب سے آخری نماز کی سب سے آخری رکعت میں ایک اور دعا پڑھی جاتی ہے جس کا نام دعائے قنوت ہے۔ یہ ایک عظیم الشان اقرار نامہ ہے جو سکون کے لمحوں میں بندہ اپنے خدا کے سامنے پیش کرتا ہے:

اللھم انا نستعینك و نستغفرك و نؤمن بك و نتوکل علیك و نثنی علیك الخیر "خدایا ہم تجھ سے مدد مانگتے ہیں۔ تجھ سے گناہوں کی معافی چاہتے ہیں۔ تجھ پر ایمان لاتے ہیں۔ تیرے ہی اوپر بھروسہ کرتے ہیں۔ اور تیری بہترین تعریف کرتے ہیں"۔ ونشکرك و نخلع و نترك من یفجرك۔ "ہم تیرا شکر ادا کرینگے، ناشکری نہیں کرینگے۔ جو تیری نافرمانی کریگا ہم اسے چھوڑ دینگے اور اس سے تعلق توڑ دینگے"۔ اللھم ایاك نعبد ولك نصلی و نسجد والیك نسعیٰ و نحفد "خدایا ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں۔ تیرے ہی لیے نماز پڑھتے اور سجدہ کرتے ہیں۔ ہماری ساری کوششوں اور ساری دوڑ دھوپ کا مقصود تو ہے۔ و نرجو رحمتك و نخشیٰ عذابك ان عذابك بالکفار ملحق "ہم تیری رحمت کے امیدوار ہیں اور تیرے عذاب سے ڈرتے ہیں کہ یقیناً تیرا عذاب کفران نعمت کرنے والوں کو آلیگا"۔

یہ عبارتیں کسی شرح وبیان کی محتاج نہیں ہیں۔ ہر شخص ان کے اندر خود دیکھ سکتا ہے کہ اسلام اپنی سول سروس اور اپنی فوج کو کن جذبات، کن ارادوں اور کن نیتوں کے ساتھ تربیت کرتا ہے، کیا چیزیں ان کے دل میں بٹھاتا ہے اور کس قسم کی خصلتیں انکے اندر پیدا کرنا چاہتا ہے۔ محض پریڈ سے تیار کی ہوئی فوج اسلام کے کسی کام کی نہیں۔ محض انتظامی قابلیت رکھنے والی سول سروس کی بھی اسے حاجت نہیں۔ اسے تو ان سپاہیوں اور ان کارکنوں کی حاجت ہے جنکے اندر باضابطگی کے ساتھ تقویٰ بھی ہو، جو سر کاٹنے اور کٹوانے کی طاقت کے ساتھ دل بدلنے اور اخلاق کو ڈھالنے کی طاقت بھی رکھتے ہوں، جو صرف زمین کا انتظام کرنے والے ہی نہ ہوں بلکہ اہل زمین کی اصلاح کرنے والے بھی ہوں۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھیے تو آپکا دل گواہی دیگا کہ اسلامی مقاصد کے لیے نماز کے سوا یا نماز سے بہتر کوئی دوسرا نظام تربیت ممکن نہیں ہے۔ جو شخص اس نظام کے تحت ٹھیک ٹھیک تربیت پالے، اسی سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ امانتوں اور ذمہ داریوں اور حقوق اللہ و حقوق العباد کا جو بار دنیوی زندگی میں اُس پر ڈالا جائیگا اس کو وہ خداترسی کے ساتھ سنبھالے گا اور قعر دریا میں رہ کر بھی دامن تر نہ ہونے دیگا۔

اسی بنا پر قرآن میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ "یقیناً نماز بے حیائی اور بدی سے روکتی ہے"۔ اسی بنا پر قدیم ترین زمانے سے نماز اسلامی تحریک کا لازمی جزو رہی ہے۔ جس قدر انبیاء خدا کی طرف سے دنیا میں آئے ہیں ان سب کی شریعت میں نماز اولین رکن اسلام تھی کیونکہ اسلام کی تحریک اس نظام تربیت کے بغیر دنیا میں چل ہی نہیں سکتی۔ اسی بنا پر قرآن کہتا ہے کہ اسلامی تحریک میں جب کبھی زوال آیا، نماز کا نظام تربیت ٹوٹ جانے کی وجہ ہی سے آیا۔ فَخَلَفَ مِنۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا "پھر ان کے بعد ایسے ناخلف لوگ آئے جنہوں نے نماز کو ضائع کر دیا اور خواہشات نفس کے پیچھے پڑ گئے، سو عنقریب وہ کج راہی میں مبتلا ہونگے"۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ اسلام کے طریقہ پر چلنے کیلیے اسلامی سیرت ضروری ہے، اور اسلامی سیرت نماز کے نظام تربیت ہی سے بنتی ہے۔ جب یہ نظام ٹوٹے گا تو سیرتیں بگڑ جائینگی، اور اس کا لازمی نتیجہ زوال و انحطاط (degeneration) ہے۔

ضبط نفس | تعمیر سیرت کے ساتھ ساتھ نماز انسان میں ضبطِ نفس (self-control) کی طاقت بھی پیدا کرتی ہے جس کے بغیر تعمیر سیرت کا مدعا حاصل نہیں ہو سکتا۔ تعمیر سیرت کا کام بجائے خود صرف اتنا ہے کہ یہ انسانی خودی (Human ego) کو تربیت دیکر مہذب بنا دیتی ہے۔ لیکن اگر اس تربیت یافتہ خودی کو اُن جسمانی اور نفسانی قوتوں پر، جو اسکے لیے آلہ کی حیثیت رکھتی ہیں، عملاً پورا قابو (Control) حاصل نہ ہو تو اُسکی تربیت و تہذیب کا مقصود، یعنی صحیح برتاؤ اور ٹھیک چلن، حاصل نہیں ہو سکتا۔ ایک مثال کے پیرایہ میں اسکو یوں سمجھیے کہ انسان ایک موٹر اور ایک ڈرائیور کے مجموعہ کا نام ہے۔ یہ مجموعہ ٹھیک کام اسی حالت میں کر سکتا ہے جب کہ موٹر کے تمام آلات اور اسکی تمام طاقتیں ڈرائیور کے قابو میں ہوں، اور ڈرائیور مہذب، تربیت یافتہ اور واقف راہ ہو۔ اگر آپ نے ڈرائیور کو تربیت دیکر تیار کر دیا، مگر اسٹیرنگ، بریک اور اکسیلریٹر پوری طرح اسکے قابو میں نہ آئے، یا آئے تو سہی مگر ڈھیلے رہے تو اس صورت میں ڈرائیور

موٹر کو نہ چلائیگا بلکہ موٹر ڈرائیور کو چلائیگی، اور چونکہ موٹر صرف چلنا جانتی ہے، بینائی، تمیز اور راستہ کی واقفیت نہیں رکھتی، اسلیے جب وہ ڈرائیور کو لیکر چلیگی تو اوندھے بیدھے راستوں پر جدھر جاہے گی اسے کھینچے کھینچے پھریگی۔ اس مثال کے مطابق انسان کی جسمانی طاقتیں اور اسکی نفسانی خواہشات اور ذہنی قوتیں موٹر کے حکم میں ہیں، اور اُسکی خودی ڈرائیور کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ موٹر ویسی ہی جاہل ہے جیسی لوہے والی موٹر ہوتی ہے، مگر وہ بے جان ہے اور یہ جاندار۔ یہ خواہشات، جذبات اور دواعیات رکھتی ہے اور ہر وقت کوشش کرتی رہتی ہے کہ ڈرائیور اس کو نہ چلائے بلکہ یہ ڈرائیور کو چلائے۔ تمام انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کا مقصود ڈرائیور کو اس طرح تیار کرنا ہے کہ وہ اس موٹر کو اپنے اوپر سوار نہ ہونے دے بلکہ خود اس پر سوار ہو اور اسے اپنے اختیار سے چلا کر اس سیدھی شاہراہ پر سفر کرے جو اُسکی منزل مقصود کی طرف جاتی ہے۔ اس غرض کے لیے صرف یہی بات کافی نہیں ہے کہ ڈرائیور کو راستہ کا علم، موٹر کا طریق استعمال اور مقصد استعمال، اور فی الجملہ ڈرائیوری کے آداب سکھا کر ایک مہذب اور تربیت یافتہ ڈرائیور بنا دیا جائے، بلکہ اسکی بھی ضرورت ہے کہ اسٹیرنگ، بریک اور اکسیلریٹر ہر وقت مضبوطی کے ساتھ کسے ہوئے رکھے جائیں اور ڈرائیور کی گرفت ان پر ڈھیلی نہ ہونے پائے، کیونکہ یہ منہ زور موٹر ہر وقت بے راہ روی کے لیے زور لگا رہی ہے۔

نماز میں دعاؤں اور تسبیحوں کے ساتھ اوقات کی پابندی، طہارت وغیرہ کی شرائط اور جسمانی حرکات کا جوڑ اسی لیے لگایا گیا ہے کہ ڈرائیور اپنی موٹر پر پوری طرح قابو یافتہ رہے اور اسے اپنے ارادہ کے تحت چلانے میں مشاق ہو جائے۔ اس طریقہ سے موٹر کی منہ زوری روزانہ پانچ وقت توڑی جاتی ہے، بریک کسے جاتے ہیں، اکسیلریٹر اور اسٹیرنگ مضبوط کیے جاتے ہیں، اور ڈرائیور کی گرفت مستحکم کی جاتی ہے۔

صبح کا وقت ہے، نیند مزے کی آرہی ہے۔ آرام طلب نفس کہتا ہے پڑے بھی رہو۔ اب کہاں اٹھ کر جاؤ گے۔ نماز کہتی ہے کہ وقت آچکا ہے، سیدھی طرح اٹھو، غسل کی حاجت ہے تو نہاؤ، ورنہ وضو کرو۔ جاڑے کا موسم ہے تو ہوا کرے، پانی گرم نہیں ہے، نہ سہی، ٹھنڈے پانی سے ہی طہارت حاصل کرو اور

چلو مسجد کی طرف ۔ ان دو متضاد مطالبوں میں سے اگر آپ نے نفس کے مطالبہ کو پورا کر دیا تو موٹر آپ پر سوار ہو گئی اور اگر نماز کے مطالبہ کو پورا کیا تو آپ موٹر پر سوار ہو گئے ۔ اسی طرح ظہر، عصر، مغرب، عشا ہر وقت نفس کسی نہ کسی مشغولیت، فائدے، نقصان، لطف، لذت، مشکلات وغیرہ کے بہانے نکالتا ہے ۔ موقع ڈھونڈتا رہتا ہے کہ ذرا آپ کے اندر کمزوری پیدا ہو اور یہ آپ پر سوار ہو جائے ۔ مگر نماز ہر موقع پر آپ کے لیے تازیانہ بنکر آتی ہے، آپکی اونگھتی ہوئی قوت ارادی کو جگاتی ہے، اور آپ سے مطالبہ کرتی ہے کہ اپنی موٹر کو اپنے حکم کا تابع بناؤ، اُسکے غلام بنکر نہ رہ جاؤ ۔ یہ معرکہ روز پیش آتا ہے ۔ مختلف اوقات، مختلف حالتوں اور مختلف صورتوں میں پیش آتا ہے ۔ کبھی سفر میں اور کبھی حضر میں ۔ کبھی گرمی میں اور کبھی جاڑے میں ۔ کبھی آرام کے وقت اور کبھی کاروبار کے وقت ۔ کبھی تفریح کے موقع پر اور کبھی رنج و غم اور مصیبت کے موقع پر ۔ ان بے شمار مختلف النوع حالتوں میں نفس کی طلب اور نماز کی پکار کے مابین کشمکش ہوتی ہے، اور آپ آزمائش میں ڈالے جاتے ہیں ۔ نفس کی بات آپ نے مانی تو شکست کھا گئے ۔ خادم آپکا آقا بن گیا ۔ اندھی، جاہل موٹر کے قابو میں آپ نے اپنے آپ کو دے دیا ۔ اب یہ ٹیڑھے بِنگے راستوں پر آپ کو لیے پھریگی اور آپ بے بسی کے عالم میں اسکے ساتھ ساتھ پھرتے رہینگے ۔ بخلاف اسکے اگر آپ نماز کا مطالبہ برابر پورا کرتے رہے تو آپ اس موٹر کا باغیانہ زور توڑ دینگے، اس پر حکمراں بن جائینگے اور آپ میں یہ طاقت پیدا ہو جائیگی کہ اپنے علم و اذعان اور اپنے ارادے کے مطابق اسکے کل پرزوں اور اسکی قوتوں سے کام لیں ۔

اسی بنا پر قرآن میں نماز کے ضائع کرنے کا فوری اور لازمی نتیجہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ آدمی شہوات اور خواہشات کا تابع بن جاتا ہے اور سیدھے راستے سے ہٹ کر ٹیڑھے راستوں میں بھٹکتا چلا جاتا ہے :

فَخَلَفَ مِنۢ بَعۡدِهِمۡ خَلۡفٌ اَضَاعُوا	پھر ان کے بعد ایسے ناخلف لوگ آئے جنہوں نے
الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوۡفَ	نماز کو ضائع کر دیا اور خواہشات کے پیچھے پڑ گئے ۔ لہذا عنقریب
يَلۡقَوۡنَ غَيًّا	وہ کج راہی میں مبتلا ہونگے ۔

افراد کی تیاری کا پروگرام یہاں تک جو کچھ بیان کیا گیا ہے یہ نماز کے فوائد و منافع کا صرف ایک پہلو ہے یعنی یہ کہ نماز افراد کو کس طرح تیار کرتی ہے۔ اب دوسرے پہلو کی طرف توجہ کرنے سے پہلے فرد کی تیاری کے اس پروگرام پر مجموعی نظر ڈال لیجیے۔ اس پروگرام کے پانچ حصے ہیں:

(۱) آدمی کے ذہن میں اس حقیقت کے ادراک کو تازہ رکھنا کہ وہ دنیا میں ایک خود مختار وجود نہیں ہے بلکہ رب العالمین کا بندہ ہے اور یہاں اسی حیثیت سے اس کو کام کرنا ہے۔

(۲) بندہ کی حیثیت سے اس کو فرض شناس بنانا اور اس میں ادائے فرض کی عادت پیدا کرنا۔

(۳) فرض شناس اور نافرض شناس میں تمیز کرنا اور نافرض شناس افراد کو چھانٹ کر الگ کر دینا۔

(۴) خیالات کا ایک پورا انتظام، ایک پوری آئیڈیالوجی آدمی کے ذہن میں اتار دینا اور اس کو ایسا مستحکم کرنا کہ ایک پختہ سیرت بن جائے۔

(۵) آدمی میں یہ قوت پیدا کرنا کہ اپنے عقیدے اور اپنے علم و بصیرت کے مطابق جس طرز عمل کو صحیح سمجھتا ہو اس پر عمل کر سکے، اور اپنے جسم و نفس کی تمام طاقتوں سے اُس راہ میں کام لے سکے۔ اس کے کیرکٹر میں اس قسم کا ڈھیلا پن نہ رہ جائے کہ صحیح تو سمجھتا ہو ایک طریقہ کو مگر اپنے نفس کی خواہش سے مجبور ہو کر چلے دوسرے طریقہ پر۔

اسلام جو سوسائیٹی بناتا ہے اس کے ایک ایک فرد کو وہ اس طرح نماز کے ذریعہ سے تیار کرتا ہے دس برس کی عمر کے بعد اس سوسائیٹی کے ہر لڑکے اور ہر لڑکی پر نماز فرض کر دی گئی ہے اور یہ فرض کسی حال میں اس سے ساقط نہیں ہوتا، اِلّا یہ کہ وہ اپنے ہوش و حواس میں نہ ہو یا عورت حیض و نفاس کی حالت میں ہو۔ بیماری میں، سفر میں، جنگ کے معرکے تک میں یہ فرض اسے ادا کرنا پڑے گا۔ اٹھ نہ سکے تو بیٹھ کر پڑھے بیٹھنا ممکن نہ ہو لیٹ کر پڑھے۔ ہاتھ پاؤں حرکت نہ کر سکتے ہوں، اشارہ سے پڑھے۔ پانی نہ ملتا ہو مٹی سے تیمم کر کے پڑھے۔ قبلے کی سمت معلوم نہ ہو، جدھر گمان ہو اسی طرف منہ کر کے پڑھے۔ غرض کوئی عذر اس معاملے میں مسموع نہیں ہے۔ نماز کا وقت جب آجائے تو ہر حال میں مسلمان مامور ہے کہ اس فرض کو ادا کرے۔

بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ اسلام کے سوا دنیا میں کوئی دوسرا اجتماعی نظام ایسا نہیں ہے جس نے اپنے اجزائے ترکیبی، یعنی اپنے افراد کو فرداً فرداً تیار کرنے کا ایسا مکمل انتظام کیا ہو۔ دنیا کے اجتماعی نظامات میں عموماً جماعت (Community) کی ہیئت ترکیبی بنانے اور افراد کو بیرونی بندشوں سے جکڑنے ہی پر تمام تر زور دیا جاتا ہے، مگر جماعت کے ایک ایک جزء کو اندر سے تیار کرنے اور جماعتی اصولوں کے مطابق بنانے کی کوشش کم کی جاتی ہے۔ حالانکہ جماعت کی حیثیت ایک دیوار کی سی ہے جو اینٹوں سے بنتی ہے۔ ایک ایک اینٹ اگر مضبوط نہ ہو تو دیوار بحیثیت مجموعی کمزور ہوگی۔ اسی طرح افراد کی سیرت میں اگر کمزوری ہو، اگر انکے خیالات جماعتی اصولوں کے مطابق نہ ہوں، اور اگر عملاً وہ جماعتی راہ کے خلاف چلنے کے میلانات رکھتے ہوں، تو محض بیرونی بندشیں جماعت کے نظام کو زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رکھ سکتیں آخرکار بغاوت رونما ہوگی اور نظام ٹوٹ جائیگا۔

تنظیم جماعت | اب ہمیں نماز کے دوسرے پہلو پر نظر ڈالنی چاہیے۔ یہ ظاہر ہے کہ انفرادی سیرت تنہا کوئی نتیجہ پیدا نہیں کرسکتی جب تک کہ جماعت (Community) میں بھی وہی سیرت موجود نہ ہو۔ فرد اپنے نصب العین (Ideal) کو پا ہی نہیں سکتا جب تک کہ وہ لوگ، جن کے درمیان وہ زندگی بسر کر رہا ہے، اس نصب العین تک پہنچنے میں اس کے ساتھ تعاون نہ کریں۔ فرد جن اصولوں پر ایمان رکھتا ہے، انکے مطابق تنہا عمل کرنا اس کے لیے ناممکن ہے، تاوقتیکہ پوری جماعتی زندگی انہی اصولوں پر قائم نہ ہو جائے۔ آدمی دنیا میں اکیلا پیدا نہیں ہوا ہے، نہ اکیلا رہ کر کوئی کام کرسکتا ہے۔ اسکی ساری زندگی اپنے بھائی بندوں، دوستوں اور ہمسایوں، معاملہ داروں اور زندگی کے بے شمار ساتھیوں کے ساتھ ہزاروں قسم کے تعلقات میں جکڑی ہوئی ہے۔ دنیا میں وہ خدا کی طرف سے ماموراسی لیے کیا گیا ہے کہ اس اجتماعی زندگی اور ان اجتماعی تعلقات میں خدا کے قانون کو جاری کرے۔ اس قانون پر عمل کرنے اور اس کو نافذ کرنے کا نام ہی عبادت ہے۔ اگر آدمی ایسے لوگوں کے درمیان گھرا ہوا ہو جو اس قانون کو مانتے ہی نہ ہوں، یا سب کے سب اسکی نافرمانی پر

ملے ہوئے ہوں، یا ان کے باہمی تعلقات اس طرح کے ہوں کہ اس کو جاری کرنے میں وہ ایک دوسرے کی مدد کرنے کے لیے تیار نہ ہوں، تو اکیلے آدمی کے لیے خود اپنی زندگی میں بھی اُس پر عمل کرنا غیر ممکن ہے، کجا کہ وہ جماعتی زندگی میں اسکو نافذ کر سکے۔

علاوہ بریں مسلمان کے لیے یہ دنیا سخت جدوجہد، مقابلہ اور کشمکش کا معرکۂ کارزار ہے۔ یہاں خدا سے بغاوت کرنے والوں کے بڑے بڑے جتھے بنے ہوئے ہیں جو انسانی زندگی میں خود اپنے بنائے ہوئے قوانین کو پوری قوت کے ساتھ جاری کر رہے ہیں۔ اور ان کے مقابلہ میں مسلمان پر یہ ذمہ داری ــــ بھاری، کمر توڑ دینے والی ذمہ داری ــــ ڈالی گئی ہے کہ یہاں خدا کے قانون کو پھیلائے اور جاری کرے، انسان کا بنایا ہوا قانون جہاں جہاں چل رہا ہے اسے مٹائے اور اسکی جگہ اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کے قانون کی حکومت قائم کرے۔ یہ عظیم الشان خدمت جو اللہ نے مسلمان کے سپرد کی ہے، اس کو باغی جتھوں کے مقابلہ میں کوئی اکیلا مسلمان انجام نہیں دے سکتا۔ اگر کروڑوں مسلمان بھی دنیا میں موجود ہوں، مگر الگ الگ رہ کر انفرادی کوشش کریں، تب بھی وہ مخالفین کی منظم طاقت کے مقابلہ میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اسکے لیے ناگزیر ہے کہ وہ سارے بندے جو خدا کی عبادت کرنا چاہتے ہیں، ایک جتھا بنیں، ایک دوسرے کے مددگار ہوں، ایک دوسرے کی پشت پناہ بن جائیں اور مل کر اپنے مقصد کے لیے جدوجہد کریں۔

ان دونوں اغراض کے لیے مسلمانوں کا صرف مل جانا ہی کافی نہیں، بلکہ یہ ملنا صحیح طریق پر ہونا چاہیے۔ صرف اجتماعی نظام پیدا ہو جانا کافی نہیں، بلکہ ایک صالح اجتماعی نظام درکار ہے جس میں مسلمان اور مسلمان کا تعلق ٹھیک ویسا ہی ہو جیسا کہ اسلام چاہتا ہے۔ ان کے درمیان مساوات ہو، محبت اور ہمدردی ہو، یک جہتی اور وحدت فی العمل (unity in action) ہو، سب کے اندر خدا کی بندگی کرنے کا مشترک ارادہ نہ صرف موجود ہو بلکہ پیہم متحرک رہے اور اجتماعی حرکت کرنے کی عادت انکی طبیعت ثانیہ بن جائے۔ ان میں سے ہر ایک یہ جانتا ہو کہ جب وہ لیڈر بنے تو جماعت میں اس کا

رویہ کیا ہونا چاہیے، اور جب کوئی دوسرا ان کا لیڈر ہو تو وہ کس طرح اسکی اطاعت کریں، کس طرح اسکے حکم پر حرکت کریں، کہاں تک اسکی فرمانبرداری اُن پر واجب ہے، کہاں انہیں اسکو ٹوکنا چاہیے، اور کس حد پر پہنچ کر وہ انکی اطاعت کا مستحق نہیں رہتا۔

نماز با جماعت نماز انفرادی سیرت کی تعمیر کے ساتھ یہ کام بھی کرتی ہے۔ وہ اس اجتماعی نظام کا پورا ڈھانچہ بناتی ہے، اسکو قائم کرتی اور قائم رکھتی ہے، اور اسے روزانہ پانچ مرتبہ حرکت میں لاتی ہے تاکہ وہ ایک مشین کی طرح چلتا رہے۔ اسی لیے پنجوقتہ نماز کو جماعت کے ساتھ ادا کرنا شرط لازم قرار دیا گیا ہے۔ شریعت کی رو سے ایک ایک شخص الگ الگ نماز پڑھ کر فرض سے سبکدوش نہیں ہو سکتا بلکہ تمام مسلمانوں کا مسجد میں حاضر ہونا اور با جماعت نماز پڑھنا اسی طرح فرض کیا گیا ہے جس طرح کہ خود نماز پڑھنا فرض ہے، الا یہ کہ کوئی شخص ایسی جگہ ہو جہاں قیام جماعت ممکن نہ ہو۔ جماعت کی اس تاکید کا مقصد یہی ہے کہ مسلمانوں کا نظام اجتماعی اپنی صحیح صورت پر قائم اور متحرک رہے۔ مسجد کا پنجوقتہ اجتماع مسلمانوں کے نظام جماعت کی بنیاد ہے۔ اس بنیاد کی مضبوطی پر اس پورے نظام کی مضبوطی منحصر ہے۔ اِدھر یہ کمزور ہوئی اور اُدھر سارا شیرازہ بکھر کر رہ جاتا ہے۔

اذان حکم ہے کہ اذان کی آواز سنتے ہی اٹھ جاؤ اور اپنے اپنے کام چھوڑ کر مسجد کی طرف رخ کرو۔ اس طلبی کی پکار کو سن کر ہر طرف سے مسلمانوں کا ایک مرکز کی طرف دوڑنا وہی کیفیت اپنے اندر رکھتا ہے جو فوج کی ہوتی ہے۔ فوجی سپاہی جہاں جہاں بھی ہوں، بگل کی آواز سنتے ہی سمجھ لیتے ہیں کہ ہمارا کمانڈر ہمیں بلا رہا ہے۔ اس طلبی پر سب کے دل میں ایک ہی کیفیت پیدا ہوتی ہے، یعنی کمانڈر کے حکم کی پیروی کا خیال، اور اس خیال کے آتے ہی سب ایک کام کرتے ہیں، یعنی اپنے اپنے کام چھوڑ کر اٹھنا اور ہر طرف سے سمٹ کر ایک جگہ جمع ہو جانا۔ فوج میں یہ طریقہ کس لیے رکھا گیا ہے؟ اسی لیے کہ اول تو ہر ہر سپاہی میں فرداً فرداً حکم ماننے اور اس پر مستعدی کے ساتھ عمل کرنے کی خصلت و عادت پیدا ہو، اور اس کے ساتھ ہی ایسے تمام فرمانبردار سپاہی مل کر ایک گروہ، ایک جتھا، ایک ٹیم بن جائیں، اور ان میں یہ عادت پیدا ہو جائے کہ کمانڈر کا حکم پاتے ہی ایک وقت میں ایک

جگہ سب مجتمع ہوجایا کریں تاکہ جب کوئی مہم پیش آئے تو ساری فوج ایک آواز پر ایک مقصد کے لیے اکٹھی ہو کر کام کر سکے۔ فوجی اصطلاح میں اسکو سرعت اجتماع (mobility) کہتے ہیں اور یہ فوجی زندگی کی جان ہے۔ اگر کسی فوج میں اس طرح جمع ہونے کی صلاحیت نہ ہو، اور اسکے سپاہی ایسے خود سر ہوں کہ جسکا جدھر منہ اٹھتا ہو ادھر چلا جاتا ہو، تو خواہ ایسی فوج کا ایک ایک سپاہی اپنی جگہ تیس مارخاں ہی کیوں نہ ہو، وہ کسی مہم کو سر نہیں کر سکتی۔ اس قسم کے ایک ہزار بہادر سپاہیوں کو دشمن کے پچاس سپاہیوں کا ایک منظم دستہ الگ الگ پکڑ کر ختم کر سکتا ہے۔ ٹھیک اسی مصلحت کی بنا پر مسلمانوں کے لیے بھی یہ قاعدہ مقرر کیا گیا ہے کہ جو مسلمان جہاں اذان کی آواز سنے، سب کام چھوڑ کر اپنے قریب کی مسجد کا رخ کرے۔ اس اجتماع کی مشق انکو روزانہ پانچ وقت کرائی جاتی ہے، کیونکہ اس خدائی فوج کی ڈیوٹی دنیا کی ساری فوجوں سے زیادہ سخت ہے جیسا کہ اوپر کہہ چکا ہوں، دوسری فوجوں کے لیے تو مدتوں میں کبھی ایک مہم پیش آتی ہے اور اسکی خاطر انکو یہ ساری فوجی مشقیں کرائی جاتی ہیں۔ مگر اس خدائی فوج کو تو ہر وقت ایک مہم درپیش ہے، اسلیے اسکے ساتھ یہ بھی بہت بڑی رعایت ہے کہ اسے دن رات میں صرف پانچ مرتبہ ہی خدائی بگل کی آواز پر دوڑنے اور خدائی چھاؤنی، یعنی مسجد میں جمع ہونے کا حکم دیا گیا ہے۔

مسجد میں اجتماع یہ تو محض اذان کا فائدہ تھا۔ اب آپ مسجد میں جمع ہوتے ہیں اور صرف اس جمع ہونے ہی میں بیشمار فائدے ہیں۔ یہاں جو آپ جمع ہوئے تو آپ نے ایک دوسرے کو دیکھا، پہچانا، ایک دوسرے سے واقف ہوئے۔ یہ دیکھنا، پہچاننا، واقف ہونا کس حیثیت سے ہے؟ اس حیثیت سے کہ آپ سب ایک خدا کے بندے ہیں، ایک رسول کے پیرو ہیں، ایک کتاب کے ماننے والے ہیں، ایک ہی مقصد سب کی زندگی کا ہے، اسی مقصد کے لیے آپ مسجد میں جمع ہوئے ہیں، اور اسی مقصد کے لیے مسجد سے باہر جا کر بھی آپ کو عمل کرنا ہے۔ اس قسم کا تعارف آپ میں خود بخود یہ خیال پیدا کر دیتا ہے کہ آپ سب ایک قوم ہیں، ایک ہی فوج کے سپاہی ہیں، ایک دوسرے کے بھائی اور رفیق ہیں، دنیا میں آپ کی اغراض، آپ کے مقاصد، آپ کے نقصانات

اور آپ کے فوائد سب مشترک ہیں، آپ کی زندگیاں ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہیں، اٹھینگے تو ایک ساتھ اور گرینگے تو ایک ساتھ۔

پھر آپ جو ایک دوسرے کو دیکھینگے تو ظاہر ہے کہ آنکھیں کھول کر دیکھینگے۔ اور یہ دیکھنا بھی دشمن کو دشمن کا دیکھنا نہیں بلکہ دوست کا دوست کو اور بھائی کا بھائی کو دیکھنا ہوگا۔ اس نظر سے جب آپ دیکھینگے کہ میرا کوئی بھائی پھٹے پرانے کپڑوں میں ہے، کوئی پریشان صورت ہے، کوئی فاقہ زدہ چہرہ لیے ہوئے آیا ہے، کوئی معذور، لنگڑا، لُولا یا اندھا ہے، تو خواہ مخواہ آپکے دل میں ہمدردی کا جذبہ بیدار ہوگا۔ آپ میں سے جو خوشحال ہیں وہ غریبوں اور بے کسوں پر رحم کھائینگے۔ جو بدحال ہیں انہیں امیروں تک پہنچنے اور اپنا حال کہنے کی ہمت ہوگی۔ کسی کے متعلق معلوم ہوگا کہ بیمار ہے یا کسی مصیبت میں پھنس گیا ہے اسلیے مسجد میں نہیں آیا تو آپ اسکی عیادت کو جائینگے۔ کسی کے مرنے کی خبر ملی تو آپ اسکے جنازہ میں شریک ہونگے اور غم زدہ عزیزوں کو تسلی دینگے۔ یہ سب باتیں آپس کی محبت کو بڑھانے والی، آپ کو ایک دوسرے کے قریب کرنے والی اور ایک دوسرے کا مددگار بنانے والی ہیں۔

اور ذرا غور کیجیے۔ یہاں جو آپ جمع ہوئے ہیں تو ایک پاک جگہ پاک مقصد کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ آپکو کسی فلم سٹار کا عشق یہاں کھینچ کر نہیں لایا ہے۔ آپ شراب خواری یا جوئے بازی کے لیے جمع نہیں ہوئے ہیں۔ یہ بدکاروں کا اجتماع نہیں ہے کہ سب کے دل میں ناپاک ارادے بھرے ہوئے ہوں۔ یہ تو اللہ کے بندوں کا اجتماع ہے، اللہ کی عبادت کے لیے ہے، اللہ کے گھر میں ہے۔ سب اپنے خدا کے سامنے بندگی کا اقرار کرنے حاضر ہوئے ہیں۔ ایسے موقع پر اول تو ایمان دار آدمی کے دل میں خود ہی اپنے گناہوں پر شرمندگی کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن اگر اس نے کوئی گناہ اپنے دوسرے بھائی کے سامنے کیا تھا اور وہ بھی یہاں مسجد میں موجود ہے تو محض اسکی نگاہوں کا سامنا ہوجانا ہی اسکے لیے کافی ہے کہ گناہ گار اپنے دل میں کٹ کٹ جائے۔ اور اگر کہیں مسلمانوں میں ایک دوسرے کو نصیحت کرنے کا جذبہ بھی موجود ہو، اور وہ جانتے ہوں کہ ہمدردی و محبت

کے ساتھ ایک دوسرے کی اصلاح کس طرح کرنی چاہیے تو یقین جانیے کہ یہ اجتماع انتہائی رحمت و برکت کا موجب ہوگا۔ اس طرح سب مسلمان مل کر ایک دوسرے کی خرابیوں کو دور کرینگے، ایک دوسرے کے نقائص کی اصلاح کرینگے اور پوری جماعت صالحین کی جماعت بنتی چلی جائیگی۔

صف بندی | یہ صرف مسجد میں جمع ہونیکی برکتیں ہیں۔ اب دیکھیے کہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے میں کتنی برکات پوشیدہ ہیں۔

سب مسلمان مسجد میں مساوی الحیثیت ہیں۔ ایک چمار اگر پہلے آیا ہو تو وہ اگلی صف میں ہوگا اور ایک رئیس اگر بعد میں آئے تو وہ پچھلی صفوں میں رہیگا۔ کوئی بڑے سے بڑا آدمی مسجد میں اپنی سیٹ ریزرو نہیں کرا سکتا۔ کسی شخص کو یہ حق نہیں کہ دوسرے مسلمان کو مسجد میں کسی جگہ کھڑے ہونے سے روک دے یا جہاں وہ پہلے سے موجود ہو وہاں سے اسکو ہٹا دے۔ کوئی اسکا مجاز نہیں کہ آدمیوں پر سے پھاند کر یا صفوں کو چیر کر آگے پہنچنے کی کوشش کرے۔ سب مسلمان ایک صف میں ایک دوسرے کے برابر کھڑے ہونگے۔ وہاں نہ کوئی بڑا ہے نہ چھوٹا۔ نہ کوئی اونچ ہے نہ نیچ۔ نہ کسی کے چھو جانے سے کوئی ناپاک ہوتا ہے۔ نہ کسی کے برابر کھڑا ہونے سے کسی کی عزت کو بٹہ لگتا ہے۔ بازار کا جاروب کش آئیگا اور گورنر کے برابر کھڑا ہو جائیگا۔ یہ وہ اجتماعی جمہوریت (Social democracy) ہے جسے قائم کرنے میں اسلام کے سوا کوئی کامیاب نہیں ہو سکا۔ یہاں روزانہ پانچ وقت سوسائیٹی کے افراد کی اونچ نیچ برابر کی جاتی ہے۔ بڑوں کے دماغ سے کبریائی کا غرور نکالا جاتا ہے۔ چھوٹوں کے ذہن سے پستی کا احساس دور کیا جاتا ہے، اور سب کو یہ یاد دلایا جاتا ہے کہ خدا کی نگاہ میں تم سب انسان یکساں ہو۔

یہ صف بندی جس طرح طبقاتی امتیازات کو مٹاتی ہے اسی طرح نسل، قبیلہ، وطن اور رنگ وغیرہ کی عصبیتوں کو بھی مٹاتی ہے۔ مسجد میں کسی امتیازی نشان کے لحاظ سے مختلف انسانی گروہوں کے بلاک الگ نہیں ہوتے۔ تمام مسلمان جو مسجد میں آئیں، خواہ کالے ہوں یا گورے، ایشیائی ہوں یا فرنگی، سامی ہوں یا آرین، اور انکے قبیلوں اور انکی زبانوں میں خواہ کتنے ہی اختلافات ہوں، بہرحال سب کے سب ایک صف

میں کھڑے ہو کر نماز ادا کرتے ہیں۔ روزانہ پانچ وقت اس نوع کا اجتماع اُن تعصبات کی بیخ کنی کرتا رہتا ہے جو انسانی جماعت میں خارجی اختلافات کی وجہ سے پیدا ہو گئے ہیں۔ یہ انسانی وحدت قائم کرتا ہے۔ بین الاقوامیت کی جڑیں مضبوط کرتا ہے، اور اس خیال کو دماغوں میں پیوست کر دیتا ہے کہ حسب و نسب اور برادریوں کی ساری عصبیتیں جھوٹی ہیں۔ تمام انسان خدا کے بندے ہیں اور اگر خدا کی بندگی و عبادت پر وہ سب متفق ہو جائیں تو پھر وہ سب ایک قوم ہیں۔

پھر جب یہ سب ایک صف میں کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہوتے ہیں اور ایک ساتھ رکوع و سجدہ کرتے ہیں تو انکے اندر منظم اجتماعی حرکت کرنے کی وہی صلاحیتیں پرورش پاتی ہیں جنہیں پیدا کرنے کیلئے فوج کو پریڈ کرائی جاتی ہے۔ اسکا مدعا ہی یہ ہے کہ مسلمانوں میں یک جہتی اور وحدت فی العمل پیدا ہو اور وہ خدا کی بندگی میں ایک دوسرے کے ساتھ جُڑ کر تنِ واحد کی طرح ہو جائیں۔

اجتماعی دعائیں صف بندی کے ان تمام فائدوں کو وہ دعائیں دو آتشہ کر دیتی ہیں جو نماز میں خدا سے مانگی جاتی ہیں۔ سب یک زبان ہو کر اپنے مالک سے عرض کرتے ہیں کہ ایاک نعبد وایاک نستعین "ہم سب تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں"۔ اھدنا الصراط المستقیم "ہم سب کو سیدھے رستہ کی ہدایت دے"۔ السلام علینا وعلی عباد الصالحین "ہم سب پر سلامتی ہو اور اللہ کے تمام نیک بندوں پر بھی"۔ نماز کی دعاؤں میں کہیں آپ کو واحد کا صیغہ نہ ملے گا۔ جہاں آپ دیکھینگے جمع ہی کا صیغہ پائینگے۔ اجتماعی عبادت اور اجتماعی حرکات کے ساتھ مل کر یہ اجتماعی دعائیں ہر مسلمان کے ذہن میں یہ نقش ثبت کر دیتی ہیں اور روزانہ ثبت کرتی رہتی ہیں کہ وہ اکیلا نہیں ہے۔ اسے سب کچھ تنہا اپنے ہی لیے چاہنا اور مانگنا نہیں ہے۔ بلکہ اسکی زندگی جماعت کے ساتھ مربوط ہے۔ جماعت کی بھلائی میں اسکی بھلائی ہے جماعت ہی کے راہ راست پر چلنے میں اسکی خیر ہے۔ خدا کی طرف سے فضل اور سلامتی جماعت پر نازل ہو گی تب ہی وہ خود بھی اس سے متمتع ہو سکے گا۔ یہ چیز دماغوں سے انفرادیت (Individualism) کو

نکالتی ہے۔ اجتماعی ذہنیت (Social mindedness) پیدا کرتی ہے۔ افراد جماعت میں خیر خواہی کے جذبات اور مخلصانہ محبت کے روابط کو نشوونما دیتی ہے۔ اور روزانہ پانچ مرتبہ اس طریقہ سے مسلمانوں کے احساس اجتماعیت کو اکسایا جاتا ہے تاکہ مسجد کے باہر زندگی کے وسیع میدان میں انکا برتاؤ درست ہونا رہے۔

امامت: یہ اجتماعی عبادت ایک امام (leader) کے بغیر انجام نہیں پاتی۔ دو آدمی بھی اگر فرض نماز پڑھیں تو لازم ہے کہ ان میں سے ایک امام بنے اور دوسرا مقتدی (follower)۔ جماعت جب کھڑی ہو جائے تو اس سے الگ ہو کر نماز پڑھنا سخت ممنوع ہے بلکہ ایسی نماز ہوتی ہی نہیں۔ حکم ہے کہ جو آتا جائے اسی امام کے پیچھے جماعت میں شامل ہوتا جائے۔ امامت کا منصب کسی طبقہ یا کسی نسل یا گروہ کے ساتھ مخصوص نہیں۔ نہ اسکے لیے کوئی ڈگری یا سند درکار ہے۔ ہر مسلمان امام بن سکتا ہے۔ البتہ شریعت یہ سفارش کرتی ہے کہ امام بنانے میں آدمی کی چند صفات کا لحاظ کیا جائے جنکا ذکر آگے آتا ہے۔

جماعت میں امام اور مقتدیوں کا تعلق جس طور پر قائم کیا گیا ہے اس میں ایک ایک چیز انتہا درجہ کی معنی خیز ہے۔ اس میں در اصل ہر مسلمان کو قیادت (leadership) اور اتباع قیادت followership کی مکمل ٹریننگ دی جاتی ہے۔ اس میں بتایا جاتا ہے کہ اس چھوٹی مسجد سے باہر اس وسیع مسجد میں جسکا نام زمین ہے مسلمانوں کا جماعتی نظام کیسا ہونا چاہیے۔ جماعت میں امام کی کیا حیثیت ہے۔ اس کے فرائض کیا ہیں۔ اس کے حقوق کیا ہیں۔ امام بننے کی صورت میں اسکا طرز عمل کیسا ہونا چاہیے۔ دوسری طرف جماعت کو اسکی اطاعت کس طرح کرنی چاہیے اور کن باتوں میں کرنی چاہیے۔ اگر وہ غلطی کرے تو مسلمان کیا کریں۔ کہاں تک غلطی میں بھی اسکی پیروی کریں۔ کہاں وہ اس کو ٹوکنے کے مجاز ہیں۔ کہاں انکو اس سے یہ مطالبہ کرنیکا حق حاصل ہے کہ اپنی غلطی کی اصلاح کرے۔ اور کس موقع پر وہ اسکو امامت سے ہٹا سکتے ہیں۔ یہ سب گویا چھوٹے پیمانہ پر ایک بڑی سلطنت کو چلانے کی مشق ہے جو ہر روز پانچ مرتبہ ہر چھوٹی سے چھوٹی مسجد میں مسلمانوں سے کرائی جاتی ہے۔

ہدایت کی گئی ہے کہ امام ایسے شخص کو منتخب کیا جائے جو پرہیزگار ہو، نیک سیرت ہو، دین کا علم رکھتا ہو اور

سن رسیدہ بھی ہو۔ حدیث میں ترتیب بھی بتادی گئی ہے کہ ان صفات میں سے کون سی صفت کس صفت پر مقدم ہے۔ یہیں سے یہ تعلیم بھی دیدی گئی کہ سردار قوم کے انتخاب میں کن چیزوں کا لحاظ کرنا چاہیے۔

حکم ہے کہ امام ایسے شخص کو نہ بنایا جائے جس سے جماعت کی اکثریت ناراض ہو۔ یوں تھوڑے بہت مخالف کس کے نہیں ہوتے لیکن اگر جماعت میں زیادہ تر آدمی کسی شخص کا اقتدا کرنے سے کراہت کرتے ہوں تو اسے امام نہ بنایا جائے۔ یہاں پھر سردار قوم کے انتخاب کا ایک قاعدہ بتادیا گیا۔ ایک بری شہرت کا آدمی جسکی بدسیرتی و بدکرداری سے عام لوگ نفرت کرتے ہوں، اس قابل نہیں ہوسکتا کہ مسلمانوں کا امیر بنایا جائے۔

حکم ہے کہ جو شخص امام بنے وہ نماز پڑھانے میں جماعت کے ضعیف لوگوں کا بھی لحاظ رکھے۔ محض جوان، مضبوط تندرست اور فرصت والے آدمیوں کو ہی پیش نظر رکھ کر لمبی لمبی قرأت اور لمبے لمبے رکوع اور سجدے نہ کرنے لگے بلکہ یہ بھی خیال رکھے کہ جماعت میں بوڑھے بھی ہیں، بیمار بھی ہیں، کمزور بھی ہیں اور ایسے مشغول آدمی بھی ہیں جو اپنا کام چھوڑ کر نماز کے لیے آئے ہیں اور جن کو نماز سے پھر اپنے کام کی طرف واپس جانا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معاملہ میں یہاں تک رحم اور شفقت کا نمونہ پیش فرمایا ہے کہ نماز پڑھاتے میں اگر کسی بچے کے رونے کی آواز آجاتی تو آپ نماز مختصر کر دیتے تھے تاکہ اگر بچے کی ماں جماعت میں شامل ہے تو اسے تکلیف نہ ہو۔ یہ گویا سردار قوم کو تعلیم دی گئی ہے کہ جب وہ سردار بنایا جائے تو جماعت میں اسکا طرز عمل کیسا ہونا چاہیے۔

حکم ہے کہ اگر نماز پڑھانے کے دوران میں امام کو کوئی ایسا حادثہ پیش آجائے جسکی وجہ سے وہ نماز پڑھانے کے قابل نہ رہے تو فوراً ہٹ جائے اور اپنی جگہ پیچھے کے آدمی کو کھڑا کردے۔ یہاں پھر سردار قوم کے لیے ایک ہدایت ہے۔ اسکا بھی فرض ہے کہ جب وہ اپنے آپ کو سرداری کے قابل نہ پائے تو خود ہٹ جائے اور دوسرے اہل آدمی کے لیے جگہ خالی کردے۔ اس میں نہ شرم کا کچھ کام ہے اور نہ خود غرضی کا۔

حکم ہے کہ امام کے فعل کی سختی کے ساتھ پابندی کرنی چاہیے۔ اسکی حرکت سے پہلے حرکت کرنا سخت

ممنوع ہے، حتیٰ کہ جو شخص امام سے پہلے رکوع یا سجدے میں جائے اسکے متعلق حدیث میں آیا ہے کہ قیامت کے روز وہ گدھے کی صورت میں اٹھایا جائیگا۔ یہاں قوم کو سبق دیا گیا ہے کہ اسے اپنے سردار کی اطاعت کس طرح کرنی چاہیے۔

امام اگر نماز میں غلطی کرے، مثلاً جہاں اسے بیٹھنا چاہیے تھا وہاں کھڑا ہو جائے یا جہاں کھڑا ہونا چاہیے تھا وہاں بیٹھ جائے تو حکم ہے کہ سبحان اللہ کہہ کر اسے غلطی سے متنبہ کرو۔ سبحان اللہ کے معنی ہیں "اللہ پاک ہے"۔ امام کی غلطی پر سبحان اللہ کہنے کا مطلب یہ ہوا کہ خطا سے پاک تو بس اللہ ہی کی ذات ہے، تم انسان ہو، تم سے بھول چوک ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ یہ طریقہ ہے امام کو ٹوکنے کا۔

اور جب اس طرح امام کو ٹوکا جائے تو اسکو لازم ہے کہ بلا کسی شرم و لحاظ کے اپنی غلطی کی اصلاح کرے اور صرف اصلاح ہی نہ کرے بلکہ نماز ختم کرنے سے پہلے اللہ کے سامنے اپنے قصور کے اعتراف میں دو مرتبہ سجدہ بھی کرے۔ البتہ اگر ٹوکے جانے کے باوجود امام کو اس امر کا پورا وثوق ہو کہ اس مقام پر اسے کھڑا ہی ہونا چاہیے تھا یا بیٹھنا ہی چاہیے تھا، تو وہ اپنے وثوق کے مطابق عمل کر سکتا ہے۔ اس صورت میں جماعت کا کام یہ ہے کہ وہ امام کا ساتھ دے، اگرچہ وہ اپنی جگہ اس امر کا یقین واثق ہی کیوں نہ رکھتی ہو کہ امام غلطی کر رہا ہے۔ نماز ختم ہو جانے کے بعد مقتدیوں کو حق ہے کہ امام پر اسکی غلطی ثابت کریں، اور اس سے مطالبہ کریں کہ دوبارہ نماز پڑھائے۔

امام کے ساتھ جماعت کا یہ طرز عمل تو صرف اُن غلطیوں کے بارے میں ہے جو معمولی جزئیات سے تعلق رکھتی ہوں۔ لیکن اگر امام سنت نبوی کے خلاف نماز کی ہیئت اور ترکیب بدل دے، یا قرآن کو تحریف کر کے پڑھے، یا نماز پڑھانے کے دوران میں کفر و شرک یا صریح معصیت کا ارتکاب کرے، یا کوئی اور ایسا فعل کرے جس سے معلوم ہو کہ یا تو وہ قانون الٰہی کی پیروی سے منحرف ہو گیا ہے یا اسکی عقل میں فتور آگیا ہے تو جماعت کا فرض ہے کہ نماز توڑ کر اس سے الگ ہو جائے اور اسے ہٹا کر کسی دوسرے شخص کو امامت کی جگہ قائم کرے۔ پہلی صورت میں امام کی پیروی نہ کرنا جتنا بڑا گناہ ہے، دوسری صورت میں اسکی

پیروی کرنا اس سے بھی بڑا گناہ ہے۔

بعینہ یہی حیثیت بڑے پیمانہ پر قوم اور اس کے سردار کے تعلق کی بھی ہے۔ جب تک سردار اسلامی کانسٹی ٹیوشن کے اندر کام کر رہا ہے اسکی اطاعت مسلمانوں پر واجب ہے۔ نافرمانی کرینگے تو گناہ گار ہونگے۔ زیادہ سے زیادہ وہ اسے ٹوک سکتے ہیں۔ لیکن اگر ان کے ٹوکنے پر بھی وہ فروعی معاملات میں غلطیاں کرے تو انہیں اسکی اطاعت پر قائم رہنا چاہیے۔ مگر جب وہ اسلامی کانسٹی ٹیوشن کی حدود سے نکل رہا ہو تو پھر وہ مسلمانوں کی جماعت کا امیر نہیں رہ سکتا۔ (باقی)

لباس کا مسئلہ

اجتماعی اور شرعی نقطۂ نظر سے

[اشاعت گذشتہ میں وعدہ کیا گیا تھا کہ اس موضوع پر میرا وہ مضمون یہاں نقل کیا جائیگا جو رسالۂ معارف بابت دسمبر ۱۹۲۹ء میں شائع ہوا تھا۔ اب جو پورے دس سال کے بعد اس پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ اس میں بہت کچھ حذف و اضافہ کی ضرورت ہے۔ چنانچہ وہ مضمون یہاں ترمیم شدہ صورت میں پیش کیا جا رہا ہے]

اگر تمدن کے پیدا کردہ زوائد سے الگ کر کے لباس کو محض اُس فطری احتیاج کے لحاظ سے دیکھا جائے جس نے اول اول انسان کو اسکے اختیار کرنے پر اُکسایا تھا، تو وہ صرف ایک ایسی چیز ہے جو شرم و حیا کے فطری جذبات کے تحت جسم کے خاص حصوں کو چھپائے، اور موسمی اثرات سے اسکو محفوظ کرے۔ اپنی سادہ صورت میں ایسا لباس جو ان دو ضرورتوں کو پورا کرتا ہو، قریب قریب ایک ہی وضع کا ہونا چاہیے، کیونکہ سب انسانوں کے جسم ایک سے ہیں، اور انکو چھپانے کی آسان اور متبادر صورتیں بھی ایک ہی سی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ موسموں کے اختلاف کی بنا پر اُن کی صورتوں میں اتنا اختلاف ہو سکتا ہے کہ جہاں گرمی ہو وہاں لباس ہلکے اور کم حصۂ جسم پر حاوی ہوں، اور جہاں سردی ہو وہاں کے لباس بھاری اور زیادہ حصۂ جسم پر چھائے ہوئے ہوں۔

قدیم ترین انسانوں کے متعلق جو معلومات ہم تک پہنچی ہیں، اُن سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ لباس جس زمانہ میں محض فطرت کے ابتدائی اقتضا، اور مجرّد انسانی ضروریات پر مبنی تھا، اس وقت اُسکی صورتوں میں کچھ بہت زیادہ تنوع نہ تھا، اور جو کچھ تھا بھی تو وہ زیادہ تر موسمی اثرات کے اختلاف کی بنا پر تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ جب انسان کے شعور نے ترقی

کی، تہذیب کی طرف قدم بڑھایا، صنعتیں پیدا ہوئیں، نئے نئے وسائل دریافت کیے گئے، اور اس فطری ملکہ نے انسان کے مزاج میں نشو و نما پایا جسے "مذاق" کہتے ہیں، تو رفتہ رفتہ فطرت کی ابتدائی ضروریات پر کچھ اور چیزوں کا اضافہ ہونے لگا۔ یہ نئے آنے والے اثرات چونکہ مختلف قوموں میں کمیت اور کیفیت کے لحاظ سے مختلف تھے، اسلیے مختلف قوموں نے ابتدائی فطری لباس پر جو اضافے کیے وہ بھی اپنی صورتوں اور کیفیتوں کے لحاظ سے لامحالہ مختلف ہی ہونے چاہییے تھے، اور فی الواقع مختلف ہوئے۔

مختلف قوموں میں لباس کی مختلف وضعوں کی پیدائش اور پھر ان کا تغیر و تبدل اور نشو و ارتقا جن بے شمار چھوٹے بڑے اسباب کے زیر اثر ہوتا ہے ان سب کا احاطہ ناممکن ہے۔ ہزارہا سال کے دوران میں قوموں کی اجتماعی زندگی اور ہر قوم کے افراد کی شخصی زندگی بے حد و حساب خارجی و داخلی تاثیرات سے متاثر ہوتی ہے جن کا ریکارڈ کہیں محفوظ نہیں رہتا، بلکہ بہت سے اثرات تو ایسے لطیف ہوتے ہیں کہ محسوس تک نہیں ہوتے۔ لیکن جزئیات سے قطع نظر کرکے اگر ہم ان بڑے بڑے عوامل کا استقصاء کریں جنکے اثر سے مختلف قوموں میں مختلف طرزوں کے لباس رواج پاتے ہیں، تو وہ حسب ذیل آٹھ عنوانات کے تحت تقسیم کیے جاسکتے ہیں:۔

(۱) جغرافی حالات جو ایک ملک کے باشندوں کو ایک خاص قسم کا لباس اور طرز معاشرت اختیار کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔

(۲) اخلاقی و مذہبی تصورات، جنکے اختلاف کی وجہ سے مختلف قوموں میں عورتوں اور مردوں کے لباس مختلف صورتیں اختیار کرتے ہیں۔

(۳) فطری مذاق، جس کا نشو و نما ہر قوم میں مختلف اثرات کے تحت مختلف طور پر ہوتا ہے، اور اسی اختلاف مذاق کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ ہر قوم کی پسند دوسری قوم سے کچھ نہ کچھ مختلف ہوتی ہے۔

(۴) طرز معاشرت، جو ہر قوم کے مخصوص جغرافی، تمدنی، معاشی اور عقلی و اخلاقی حالات کے تحت ایک مخصوص صورت میں نشو و نما پاتا ہے، اور ہر قوم فطرۃً اسی وضع کا لباس اختیار کرتی ہے جو اس کے عام طرز معاشرت

سے مناسبت رکھتا ہو۔

(۵) معاشی حالت، جس کے تحت ایک قوم کے عام ذرائع کسب معیشت، اسکے پیشے، اسکی صنعتیں، اور اسکی مالی حالت (افلاس یا خوشحالی) سب چیزیں آجاتی ہیں۔ ہر قوم کا لباس لازمی طور پر اس کے اِن حالات کے مطابق ہوتا ہے اور اُن کے تغیر کے ساتھ ساتھ فطرۃً لباس میں بھی تغیر ہوتا جاتا ہے۔

(۶) تہذیب و شائستگی، جس میں ہر قوم ایک خاص مرتبے پر ہوتی ہے اور اس کا قومی لباس لا محالہ اسکی تہذیب و شائستگی کے معیار کا ساتھ دیتا ہے۔

(۷) قومی روایات، جن کے تحت ایک نسل اپنے بزرگوں سے ایک خاص قسم کا طرزِ زندگی اور طرزِ لباس وراثت میں پاتی ہے، اور تھوڑا بہت تغیر و تبدل کرکے اپنے بعد کی نسل کے لیے چھوڑ جاتی ہے۔ مظاہر زندگی کا یہ تسلسل درحقیقت قومی وجود کے تسلسل کا ضامن ہوتا ہے، اسلیے ہر قوم فطرۃً اسکو عزیز رکھتی ہے۔

(۸) بیرونی اثرات، جو ہر قوم کے خیالات اور طرزِ زندگی پر دوسری قوموں کے میل جول سے پڑتے ہیں، مگر یہ امر کہ ایک قوم کس حد تک اور کس طرح دوسروں سے اثر پذیر ہوتی ہے، بڑی حد تک اس کے سیاسی، اور ذہنی و اخلاقی حالات پر منحصر ہوتا ہے۔

یہ وہ بڑے بڑے عوامل ہیں جو ایک قوم کے لباس، اور صرف لباس ہی نہیں بلکہ اسکی پوری اجتماعی زندگی پر ہمہ گیر اقتدار رکھتے ہیں اور ہر قوم کا لباس انہی کے مشترک عمل کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس تجزیہ کی مدد سے جب ہم قومی لباس کے مسئلہ پر نظر ڈالتے ہیں تو دو بنیادی حقیقتیں ہمارے ہاتھ آتی ہیں:

ایک یہ کہ لباس محض ایک بیرونی آلۂ ستر پوشی اور اوپری ذریعۂ حفاظتِ جسم ہی نہیں ہے بلکہ قومی نفسیات، قومی تہذیب و تمدن، قومی روایات، اور قوم کی اجتماعی حالت کے اندر بہت گہری جڑیں رکھتا ہے وہ دراصل اس روح کا مظہر اور ذریعۂ نمود ہے جو جسم قومی میں کار فرما ہوتی ہے۔ ہر قوم کا لباس درحقیقت ایک زبان ہے جسکے ذریعہ سے اسکی قومیت کلام کرتی ہے اور دنیا کو اپنی اجتماعی معنویت سے روشناس کراتی ہے۔

دوسرے یہ کہ لباس کی تہ میں جتنے عوامل کارفرما ہیں، جغرافی حالات کے سوا باقی سب ایسے ہیں جو ہر قوم میں ہر آن ایک غیر محسوس رفتار کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ ان میں کوئی چیز ساکن و جامد نہیں ہے، بلکہ ہر ایک فطرۃً تغیر پذیر ہے۔ اور ان کا تغیر و ارتقار لازمی طور پر صرف لباس ہی پر نہیں بلکہ پوری قومی زندگی پر آہستہ آہستہ اثر انداز ہوتا رہتا ہے۔ ایک ترقی کرنے والی قوم میں جب علوم و فنون پھیلتے ہیں، خیالات میں روشنی آتی ہے، صنعت و حرفت اور تجارت کو فروغ ہوتا ہے، معاشی حیثیت سے خوشحالی بڑھتی ہے، دوسری قوموں کے ساتھ زیادہ میل جول کا موقع ملتا ہے، اور ان کے اخلاق و معاشرت اور تہذیب و تمدن سے اسکو مختلف قسم کے سبق حاصل ہوتے ہیں تو قدرتی طور پر خود بخود اُسکی اجتماعی زندگی میں ایک ارتقائی حرکت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے جذبات بدلتے ہیں، فطری مذاق سدھرتا ہے، طرز معاشرت میں خوبی و نفاست آجاتی ہے، شائستگی کا معیار بلند ہوتا ہے، نئی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے نئی صورتیں اختیار کی جاتی ہیں، قومی روایات کا احترام زیادہ ستھری شکلوں میں ظاہر ہوتا ہے، اور زندگی کے تمام شعبوں کی تدریجی ترقی کے ساتھ ساتھ قومی لباس بھی مادہ و صورت دونوں کے اعتبار سے زیادہ حسین، زیادہ خوش وضع اور زیادہ شائستہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس ارتقائی عمل کی کسی منزل میں بھی اسکی ضرورت پیش نہیں آتی کہ ساری قوم کے لیے لباس کی کوئی خاص تراش مقرر کرنے یا کسی خاص طرز لباس کو رائج کر دینے کی زحمت اٹھائی جائے، بلکہ اجتماعی عوامل کی مشترک گردش کے اثر سے خود بخود پرانے اوضاع لباس میں اصلاحیں ہوتی جاتی ہیں، نئی نئی وضعیں چل نکلتی ہیں، اور مجموعی حیثیت سے پوری قوم کا مذاق و مزاج اپنی افتاد و پرداز کے مطابق لباس کو بہتر بناتا چلا جاتا ہے۔

قومی لباس کی پیدائش، اسکے تغیر و تبدل اور اس کے نشوو ارتقار کی فطری صورت یہی ہے۔ اور اس کے برعکس غیر فطری یا مصنوعی صورت یہ ہے کہ ایک قوم کا لباس بتکلف بدلوایا جائے اور کسی دوسری قوم سے اس کا لباس مانگ لایا جائے۔ جہاں تک نفس تغیر کا تعلق ہے، وہ فطری ارتقار کی صورت میں بھی

ہوتا ہے اور غیر فطری انقلاب کی صورت میں بھی۔ مگر دونوں قسموں کے تغیر میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ پہلی قسم کا تغیر ایسا ہے جیسے ایک درخت کا نشو و نما، کہ وہ جتنا جتنا بڑھتا ہے، اسکے رنگ روپ، جسامت، پھول پھل، پتیوں اور شاخوں میں تغیرات واقع ہوتے رہتے ہیں، مگر ان تمام تغیرات کے باوجود درخت کی خودی جوں کی توں رہتی ہے۔ املی کا درخت ہے تو آخر وقت تک املی کا ہی درخت رہیگا، اور آم کا درخت ہے تو ارتقار کے ہر درجہ میں اسکی آمیت بدستور قائم رہیگی۔ زمین، ہوا، پانی، گرمی، دھوپ، ہر ایک چیز سے وہ بہت کچھ لیگا، مگر جو کچھ بھی لیگا اسے اپنی خودی کا جزء بنا لیگا۔ بخلاف اسکے دوسری قسم کا تغیر ایسا ہے جیسے ایک درخت چلا تو تھا املی ہونے کی حیثیت سے مگر یکایک اس پر آم کی چھال لاکر چپکا دی گئی اور آم ہی کی شاخیں اور پتیاں اس پر جڑ دی گئیں۔ اب کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ عجوبہ فی الحقیقت ہے کیا۔ آم ہے کہ املی؟ اس طرح کے مصنوعی اور جعلی تغیرات سے فی الواقع کوئی حقیقی اور نتیجہ خیز تغیر پیدا نہیں ہوتا، بلکہ فطری ارتقار کے راستہ میں الٹا خلل واقع ہوتا ہے۔ مگر جو لوگ اجتماعی مسائل میں کوئی بصیرت نہیں رکھتے اور محض سطحی نظر سے زندگی کے معاملات کو دیکھتے ہیں، وہ بچوں کی سی سادہ لوحی کے ساتھ یہ خیال کرتے ہیں کہ لباس اور طرز معاشرت کی کچھ ظاہری شکلوں کے بدل دینے سے ایک قوم فی الحقیقت بدل جاتی ہے۔

عموماً تغیر لباس کے حق میں جو دلائل پیش کیے جاتے ہیں وہ یہ ہیں کہ اس سے ایک پس ماندہ قوم کی ذہنیت بدلتی ہے۔ سکون و جمود کی جگہ حرکت پیدا ہوتی ہے۔ تنزل و انحطاط کے دور کا لباس اتارتے ہی وہ تمام اندرونی کمزوریاں جو اس دور کے ساتھ مختص تھیں، اور وہ ساری دلچسپیاں جو اس دور کی زندگی کے ساتھ وابستہ تھیں یکایک کافور کی طرح اڑ جاتی ہیں، اور نیا لباس پہنتے ہی، خصوصاً جبکہ وہ کسی ترقی یافتہ قوم سے لیا گیا ہو، قوم کے نفسیات اور اسکی زندگی میں ایک آنی اور دفعی تغیر واقع ہوتا ہے۔ اس میں خود بخود ترقی یافتہ ہونے کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو آگے بڑھی ہوئی قوموں کے برابر سمجھنے لگتی ہے۔ دوسری قومیں بھی اس کو اپنے برابر کا سمجھنے لگتی ہیں۔ اور جب وہ ترقی یافتہ قوموں کا سا طرز زندگی اختیار کر لیتی ہے تو اس میں انہی جیسی

شائستگی عملی سرگرمی اور فعلیت بھی پیدا ہو جاتی ہے، کیونکہ مہذب اور کارکن قوموں میں جو لباس اور طرز زندگی پیدا ہوا ہے اسے اختیار کرنا مہذب اور کارکن بننے کے لیے ضروری بھی ہے اور مفید بھی ــــ یہ اور اسی قسم کے بہت سے دلائل اس فعل کی تائید میں دیئے جاتے ہیں۔ لیکن یہ سب محض سطحی تخیلات ہیں جنکی تہ میں کوئی تفکر اور کوئی بصیرت نہیں ہے۔ پھر ان خیالات کی سند میں بعض بڑی بڑی نامور شخصیتیں بھی پیش کی جاتی ہیں، اور یہ توقع کی جاتی ہے کہ ان شخصیتوں کے نام سنتے ہی آدمی پر ہول طاری ہو جائیگا۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ جن کی سند پیش کی جاتی ہے فکر و بصیرت کے اعتبار سے ان کا درجہ بھی ان لوگوں سے کچھ زیادہ اونچا نہیں ہے جو انکی سند پیش کرتے ہیں۔ اپنے متبعین کی طرح وہ بیچارے خود بھی فکری حیثیت سے سطحی ہیں اور علمی حیثیت سے کم مایہ ہیں۔ ہنگامی حالات میں کامیاب تدبیریں اختیار کرکے اگر کسی نے اپنی قوم کو تباہی سے بچا لیا ہو تو بلاشبہ وہ قدر و عزت کا مستحق ہے، مگر اسکی قدر اتنی ہی کی جا سکتی ہے جتنا وہ فی الواقع ہے، اور اسی حیثیت سے کی جا سکتی ہے جس حیثیت سے اس نے کارنمایاں انجام دیا ہے۔ اسکے حقیقی مرتبہ سے آگے بڑھا کر اسے فکری رہنما کی حیثیت دینا ایسی ہی بے عقلی ہے جیسے کسی اچھے انجنیر نے اگر سیلاب کے آگے بند باندھ کر کسی بستی کو تباہی سے بچا لیا ہو تو اسے ہر معنی میں برا عظم اور نجات دہندہ سمجھ لیا جائے اور کہا جائے کہ اب محکمہ حفظان صحت کا نگراں بھی اسی کو بنا دو اور تعلیمات کی نگرانی بھی اُسی کے سپرد کر دو۔

اصولی حیثیت سے جو کچھ اوپر بیان کیا جا چکا ہے وہ تغیر پسند حضرات کے دلائل کی غلطی واضح کرنے کے لیے بالکل کافی ہے۔ لیکن زمانے کی روش کے اثر سے جو غلط فہمیاں عام طور پر دماغوں میں گھر کر چکی ہیں ان کا نکلنا مشکل نظر آتا ہے۔ لہٰذا ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اسکے خلاف میں اپنے دلائل زیادہ صراحت کے ساتھ بیان کروں:

(۱) پہلے یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ لباس کی وضع قطع بجائے خود کوئی مستقل بالذات چیز نہیں ہے بلکہ بہت سے قدرتی اور اجتماعی عوامل کے مشترک عمل کا نتیجہ ہے۔ یہ حقیقت اگر تسلیم کر لی جائے تو یہ بھی تسلیم کرنا پڑیگا کہ ان

عوامل کے عمل سے کسی قوم میں جو خاص وضع لباس پیدا ہوئی ہو وہی اسکی فطری وضع ہے اُس کو ترک کرکے یکایک کوئی ایسی نئی وضع اختیار کرلینا جو مناسب طور پر ان عوامل کے مشترک عمل سے نہ پیدا ہوئی ہو بالکل خلاف وضع فطری ہے ۔

(۲) ایک قوم کے لباس کا نہایت قریبی تعلق اسکے طرز معاشرت سے ہوتا ہے، اور اس کا طرز معاشرت اسکی پوری تمدنی زندگی سے کئی طرح کے روابط اور مناسبتیں رکھتا ہے ۔ لباس و طرز معاشرت کے فطری تغیرات میں تو یہ تمام مناسبتیں برقرار رہتی ہیں، کیونکہ اس صورت میں زندگی اپنے تمام شعبوں کے ساتھ بحیثیت مجموعی حرکت کرتی ہے ۔ لیکن اگر غیر فطری طریقہ پر تکلف اور تصنع کے ساتھ لباس و طرز معاشرت کو بدل دیا جائے، یا صرف لباس میں تغیر کر دیا جائے تو ساری اجتماعی زندگی میں ایک برہمی و بے ربطی پیدا ہو جاتی ہے ۔ اسلیے کہ زندگی کے دوسرے شعبے اس تغیر کا ساتھ نہیں دیتے اور ایک دوسرے سے بے جوڑ ہو کر رہ جاتے ہیں ۔

(۳) لباس کا شائستہ و خوبصورت اور ترقی یافتہ حالات کے مناسب ہونا دراصل اس پر منحصر ہے کہ قوم خود اجتماعی حیثیت سے ترقی کرے اور ایک شائستہ، متمدن، خوش مذاق، روشن خیال اور عملی قوم بن جائے ۔ اس راہ میں وہ جتنی جتنی آگے بڑھتی جائیگی اسی نسبت سے اس کے قومی لباس میں خود بخود اصلاح ہوتی جائیگی ۔ ترقی پذیر نفس اجتماعی آپ سے آپ خالص فطری طریقے سے بلا ارادہ اور بلا تکلف کچھ اپنی پرانی چیزوں میں ترمیم و اصلاح کریگا اور کچھ دوسروں کی مناسب چیزیں لے کر اپنے ہاں اس طرح سجالیگا کہ وہ موزونیت کے ساتھ اس میں کھپ جائینگی ۔ اصلاح و ترقی میں پیش قدمی کے اس فطری طریقے کو چھوڑ کر آنِ واحد میں ایک لباس کی جگہ دوسرا لباس بدل لینا ایسا ہی ہے جیسے چھلانگ مار کر ایک حالت سے دوسری حالت میں پہنچ جانے کی کوشش کی جائے ۔ اجتماعی زندگی میں اس قسم کی چھلانگیں مارنے سے کوئی حقیقی تغیر واقع نہیں ہوتا ۔

(۴) کسی قوم کی اجتماعی حالت کے ترقی کرنے سے پہلے اس کے لباس و معاشرت کو بلند کرنا اور اسے کسی ایسے مرتبے پر لے جانے کی کوشش کرنا جو اسکے حقیقی اجتماعی مرتبہ سے اونچا ہو، بالکل ایسا ہے جیسے کسی نابالغ بچے کو ہیجان خیز ماحول میں رکھ کر، گرم گرم غذائیں اور تیز دوائیں کھلا کر زبردستی حدِ بلوغ کو پہنچایا جائے۔ اس طرح کی غیر معمولی "تبلیغ" سے اس غریب بچے کے نظام جسمانی و احوال ذہنی میں جو شدید اختلال برپا ہوگا، اسی پر اُس برہمی و ابتری کو قیاس کر لینا چاہیے جو زبردستی "مہذب و شائستہ" بنائے جانے سے کسی قوم کے اجتماعی نظام اور اسکی ذہنی و اخلاقی حالت میں برپا ہوگی۔

(۵) ایک قوم کی معاشی حالت جس طرزِ لباس و معاشرت کا بار برداشت کر سکتی ہو اس سے زیادہ بھاری لباس و معاشرت کا بوجھ اس پر لاد دینا اسے عملاً تباہ کرنے کا ہم معنی ہے۔ لباس و معاشرت کے ساتھ وہ خوشحال قوموں کے دوسرے تمدنی ڈھنگ اختیار کرنے کی بھی کوشش کریگی، اور اسکے نتائج اسکے حق میں تباہ کن ہونگے۔

(۶) لباس زبان اور رسم الخط وہ اولین چیزیں ہیں جنکے سہارے ایک قوم کی انفرادیت قائم ہوتی ہے۔ اگر کسی قومیت کے ان سہاروں کو گرا دیا جائے تو اسکی انفرادیت آہستہ آہستہ محو ہونے لگتی ہے اور آخر کار وہ دوسری قوموں میں جذب ہو کر رہ جاتی ہے۔ قدیم زمانہ کی وہ قومیں جو آج صفحۂ ہستی سے ناپید ہو چکی ہیں، اور جنہیں ہم امم بائدہ کے الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں، سب کی سب اسی وجہ سے فنا ہوئیں۔ ان کے فنا ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ اشخاص جن پر وہ قومیں مشتمل تھیں، سب مٹ گئے اور کوئی نسل دنیا میں چھوڑ کر نہیں گئے۔ بلکہ دراصل انکی گم شدگی اور فنائیت اس معنی میں ہے کہ انکی قومی انفرادیت باقی نہیں رہی۔ انہوں نے اپنی قومیت کے سہاروں کو خود گرا دیا، یا گر جانے دیا۔ ان کے افراد دوسری قوموں کے لباس، زبان، رسم الخط اور آدابِ معاشرت اختیار کرتے چلے گئے، یہاں تک کہ انکی قومیت مضمحل ہوتے ہوتے ناپید ہو گئی۔
یہی حشر اب بھی ان قوموں کے لیے مقدر ہے جو اپنے نادان لیڈروں کی احمقانہ تدبیروں کو ترقی کا ذریعہ سمجھ

کر قبول کر رہی ہیں ۔

(۷) ایک قوم کا دوسری قوم کے لباس و طرزِ معاشرت کو اختیار کرنا دراصل احتقارِ نفس کا نتیجہ اور اس کا اعلان ہے ۔ اسکے معنی دراصل یہ ہیں کہ وہ اپنے آپ کو خود ذلیل، ادنی اور پست سمجھتی ہے ۔ اس کے پاس کچھ نہیں ہے جس پر وہ فخر کر سکے ۔ اسکے اسلاف کوئی ایسی چیز چھوڑ جانے کے قابل ہی نہ تھے جسے وہ شرم کیے بغیر برقرار رکھ سکتی ہو ۔ اس کا قومی مذاق اتنا پست اور اس کا قومی ذہن اتنا کند ہے، اور اسکے اندر تخلیقی قوتوں کا ایسا فقدان ہے کہ وہ خود اپنے لیے کوئی بہتر طرزِ زندگی پیدا نہیں کر سکتی ۔ وہ اپنے آپ کو مہذب دکھلانے کے لیے سب کچھ دوسروں سے مانگ لاتی ہے، اور بغیر کسی شرم کے دنیا کے سامنے اس بات کا اعلان کرتی ہے کہ تہذیب، شائستگی، حضارت اور حسن و جمال جو کچھ بھی ہے دوسروں کی زندگی میں ہے ۔ وہی ہر کمال کا معیار ہیں اور ہم خود سینکڑوں ہزاروں برس کی قومی زندگی میں گویا بس جانوروں کی طرح جیتے رہے ہیں ۔ ہم کوئی چیز بھی ایسی پیدا نہ کر سکے جو قدر و عزت کے لائق ہو یا زندہ رہنے کی مستحق ہو ـــــ یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ جس قوم میں خود داری کا شائبہ بھی باقی ہو وہ اس طرح اپنی ذلت و پستی کا مجسم اشتہار بننا گوارا نہیں کر سکتی ۔ تاریخ اس بات پر گواہ ہے اور خود موجودہ زمانہ کے حالات جو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، اس امر پر شہادت دیتے ہیں کہ اس حقیر و ذلیل حیثیت کو ایک قوم دو ہی حالتوں میں گوارا کرتی ہے ۔ یا تو اُس وقت جبکہ وہ ہر میدان میں دوسری قوموں سے پٹ کر اور پیہم شکستیں کھا کر ہار مان لے اور ڈگیں ڈال دے، مثلاً ہندوستان، ٹرکی، ایران وغیرہ ۔ یا پھر اس صورت میں جبکہ فی الواقع اُسکی پُشت پر کسی قسم کی قابلِ فخر روایات (traditions) نہ ہوں، اسکی اپنی کوئی تہذیب و ثقافت پہلے سے نہ رہی ہو، اس میں اعلیٰ درجہ کی تخلیقی قوتیں بھی نہ ہوں، اور وہ اقوامِ عالم کے درمیان محض ایک نو دولتے (upstart) کی حیثیت رکھتی ہو، جیسے جاپان ۔

(۸) ایک قوم سے دوسری قوم کو اگر کوئی چیز لینی چاہیے اور کوئی چیز درحقیقت لینے کے قابل ہے

تو وہ محض اسکی علمی تحقیقات کے نتائج، اسکی تخلیقی و اختراعی قوتوں کے ثمرات، اور اسکے وہ عملی طریقے ہیں جن سے اس نے دنیا میں کامیابی حاصل کی ہے۔ اسکی تاریخ میں، یا اسکی تنظیمات میں، یا اس کے اخلاقیات میں اگر کوئی مفید سبق ہے تو اسے ضرور حاصل کرنا چاہیے۔ اسکی ترقی اور کامیابی کے اسباب کا پوری چھان بین کے ساتھ استقصار کرنا چاہیے، اور ایک ایک چیز جو مفید ہو اسے لے لینا چاہیے۔ یہ چیزیں انسانیت کی مشترک میراث ہیں۔ ان کی قدر نہ کرنا، اور ان کے لینے میں قومی عصبیت کی بنا پر بخل کرنا محض جاہلیت ہے۔ لیکن ان چیزوں کو چھوڑ کر دوسری قوم سے اس کے پہننے کے کپڑے اور اس کے رہنے سہنے کے طریقے اور اس کے کھانے کی چیزیں مانگنا، اور انہی کو ترقی کا ذریعہ سمجھنا، بجز اسکے کہ کند ذہنی کی علامت ہے اور کچھ نہیں۔ کیا کوئی عقلمند ایک لمحہ کے لیے بھی یہ تصور کر سکتا ہے کہ یورپ نے کوٹ، پتلون، ٹائی، کالر، ہیٹ اور بوٹ کے ذریعہ سے ترقی کی ہے؟ یا اس کی ترقی کے اسباب یہ ہیں کہ وہ چھری کانٹے سے کھانا کھاتا ہے؟ یا اسکی تزئین و آرائش کے سامان، پاؤڈر اور لپ سٹک اور کاسمیٹکس وغیرہ اسکو اُڑا کر ترقی کے آسمان پر لے گئے ہیں؟ یہ بات اگر نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ نہیں ہے تو آخر کیا وجہ ہے کہ اصلاح و ترقی کا نام لینے والے سب سے پہلے انہی چیزوں کی طرف لپکتے ہیں؟ کیوں انکی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ یورپ کی زندگی میں یہ چمک دمک جو نظر آتی ہے یہ دراصل صدیوں کی پیہم جدوجہد کا ثمرہ ہے، اور جو قوم بھی لگاتار محنت اور صبر و عزم کے ساتھ کام کرے اسکی زندگی اسی طرح قابلِ رشک ہو سکتی ہے جس طرح آج یورپ کی زندگی پر رشک کیا جاتا ہے؟

ان دلائل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ایک قوم کا کسی دوسری قوم کے لباس و معاشرت کو اختیار کرنا ایک غیر طبعی اور غیر معقول حالت ہے اور اس میں کسی پہلو سے بھی کوئی معقولیت نہیں ہے۔ معمولی حالات میں کوئی شخص یہ سوچنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کر سکتا کہ اسکے گردوپیش جو عام طریق زندگی پہلے سے رائج ہے اسے وہ کیوں چھوڑ دے اور کیوں اسکی جگہ اجنبی لوگوں کا طریقِ زندگی اختیار کرے۔ اس قسم کے خیالات

ہمیشہ غیر معمولی حالات (Abnormal conditions) ہی میں پیدا ہوا کرتے ہیں، اور انکی مثال بالکل ویسی ہی ہے جیسے زمانۂ حمل میں بعض عورتیں مٹی کھانے لگتی ہیں یا جب آنکھ کی ساخت میں خرابی آجاتی ہے تو آدمی ہر چیز کو ٹیڑھا دیکھنے لگتا ہے۔

شرعی نقطۂ نظر یہاں تک جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ خالص اجتماعی نقطۂ نظر سے تھا۔ اب ہم شریعت اسلام کے نقطۂ نظر سے اس مسئلہ پر ایک نگاہ ڈالینگے۔

اسلام دین فطرت ہے۔ وہ ہر معاملہ میں وہی طریقہ اختیار کرتا ہے جو عقل عام اور فطرت سلیمہ کے عین مطابق ہے۔ آپ رنگین عینکیں اتار کر صاف نگاہ سے معاملات کو انکی حقیقی و فطری صورت میں دیکھیے۔ اس طرح کے مشاہدہ سے جس نتیجہ پر آپ پہنچینگے وہ بعینہٖ وہی نتیجہ ہوگا جس پر اسلام پہنچا ہے۔ وہ کوئی خاص لباس اور کوئی خاص طرز زندگی انسان کے لیے مقرر نہیں کرتا، بلکہ فطری طور پر جس جس طرز زندگی اور وضع لباس نے نشو و نما پایا ہے، اس کو جوں کا توں تسلیم کر لیتا ہے۔ البتہ خالص اخلاقی اور اجتماعی نقطۂ نظر سے وہ چند اصول مقرر کرتا ہے، اور چاہتا ہے کہ ہر قوم اپنے قومی لباس و طرز معاشرت میں ان اصولوں کے مطابق اصلاح کرلے۔

ان میں سب سے پہلی چیز ستر کے حدود ہیں۔ اخلاق کے نقطۂ نظر سے اسلام اسکو ضروری سمجھتا ہے کہ تمام مرد خواہ وہ کسی ملک اور کسی قوم کے ہوں لازمی طور پر اپنے جسم کے ان حصوں کو چھپائیں جو ناف اور گھٹنے کے درمیان ہیں۔ اور تمام عورتیں خواہ وہ زمین کے کسی خطہ میں رہتی ہوں، چہرے اور ہاتھ پاؤں کے سوا اپنے پورے جسم کو مستور رکھیں[1]۔ اگر کسی قوم کی وضع لباس ایسی ہو کہ ستر کی یہ شرطیں اس میں پوری نہ ہوتی

[1] یہ واضح رہے کہ عورت کے لیے یہ ستر کے حدود ہیں، نہ کہ حجاب کے۔ ستر وہ چیز ہے جسے عورت کو اپنے شوہر کے سوا ہر ایک سے چھپانا چاہیے، خواہ وہ اسکا باپ یا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔ اور حجاب اس سے زائد ایک چیز کا نام ہے جس میں قریبی رشتہ داروں اور غیر مردوں کے درمیان فرق کیا جاتا ہے۔ اسلام اس کو جائز نہیں رکھتا کہ عورتیں اپنی خانگی زندگی کے حدود سے باہر اپنے حسن اور اپنی آرائش کی نمائش کرتی پھریں۔

ہوں تو اسلام اس سے مطالبہ کریگا کہ اپنی وضع میں ان خرابیوں کے مطابق اصلاح کرے - اور جب وہ اصلاح کریگی تو اسلام کا منشار پورا ہو جائیگا۔ پھر اسکو اس سے کوئی بحث نہیں کہ وہ کس تراش خراش کا لباس پہنتی ہے -

دوسری ضروری اصلاح جو اسلام نے تجویز کی ہے وہ یہ ہے کہ مرد ریشم کا لباس اور سونے چاندی کے زیورات پہننا چھوڑ دیں - اور مرد اور عورتیں سب ایسے لباس پہننے سے احتراز کریں جن سے فخر و غرور، بے جا نمائش، اور عیش پسندی کا اظہار ہوتا ہو - وہ تکبر کے لباس جو زمین پر لٹکتے ہوئے چلتے ہیں، اور جنہیں پہن کر ایک انسان دوسرے انسانوں کے مقابلہ میں اپنی بڑائی جتاتا ہے، اسلام کی نظر میں لعنت کے قابل ہیں - وہ فخر و ریار کے لباس جنہیں پہن کر ایک طبقہ کے لوگ عام انسانوں پر اپنی شان اور ترفع کا رعب جمانے ہیں اور اپنی خوشحالی کی نمائش کرتے ہیں، اسلام کے نزدیک حرام ہیں - وہ بھڑکیلے لباس بھی اسلام کو پسند نہیں جنکے اندر نفس پرستی اور عیاشی کی پرورش ہوتی ہے - ان چیزوں کو اپنی پوشش سے خارج کر دیجیے - پھر آپ کے لیے وہی وضع لباس اسلامی وضع ہے جو آپکے ملک میں رائج ہو، یا آپ کی سوسائٹی میں مستعمل ہو -

تیسری چیز جس کا مطالبہ اسلام کرتا ہے وہ یہ ہے کہ شرک اور بت پرستی کی وہ مخصوص علامتیں جنہیں کسی مذہبی فرقے نے اپنے لیے خاص کر رکھا ہو، آپکے لباس سے خارج ہو جانی چاہییں - مثلاً زنار، صلیب، تصویریں، یا ایسی ہی دوسری چیزیں جو غیر اسلامی شعائر کی تعریف میں آتی ہوں -

ان اخلاقی و تمدنی اصلاحات کے ساتھ ہر ملک اور ہر قوم کا لباس تقویٰ اور شائستگی کے اس معیار پر آجاتا ہے جو اسلام نے تجویز کیا ہے - مگر اس کے ساتھ ہی اسلام یہ بھی چاہتا ہے کہ مسلمانوں کے لباس میں کوئی ایسی امتیازی چیز ضرور ہو جس سے وہ غیر مسلموں کے مقابلہ میں ممیز ہو سکتے ہوں، تاکہ وہ غیر مسلموں میں خلط ملط نہ ہو جائیں اور ایک دوسرے کو پہچان سکیں، اور ان کے درمیان جماعتی زندگی مستحکم ہو سکے - اس غرض کے لیے اسلام نے کوئی خاص وضع یا علامت مقرر نہیں کی ہے، بلکہ اسے عرف عام پر چھوڑ دیا ہے - عرب میں جب اسلامی تحریک کا آغاز ہوا تو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے مسلمان وہی لباس پہنتے تھے

جو عرب کا عام قومی لباس تھا۔ لیکن آنحضرت صلعم نے مسلمانوں کو مشرکین عرب سے ممتاز کرنے کے لیے یہ علامت تجویز فرما دی تھی کہ مسلمان ٹوپی پر عمامہ باندھیں[1]۔ عام عرب یا تو صرف ٹوپی پہنتے تھے یا صرف عمامہ ٹوپی پر عمامہ باندھنا مسلمانوں کے لیے وجہ امتیاز بن گیا، اور اتنے امتیاز کو اس غرض کے لیے کافی سمجھا گیا کہ اس نئی تحریک کے پیرو اپنے ملک کے عام باشندوں سے الگ پہچانے جاسکیں۔ بعد میں جب تمام عرب مسلمان ہوگیا تو اس علامت کی حاجت باقی نہ رہی، کیونکہ اب عربی لباس ہی اسلامی لباس بن گیا تھا، اور اس لباس کو پہننے والا کوئی شخص کافر و مشرک نہ رہا تھا کہ اسے مسلمانوں سے ممیّز کرنے کے لیے کسی امتیازی نشان کی حاجت ہوتی۔ اسی طرح جب ایران اور دوسرے ممالک میں اسلام پھیلنا شروع ہوا تو اول اول اس بات کی ضرورت پیش آئی کہ نومسلم یا تو عربی لباس پہنیں یا اپنے پرانے ملکی لباس میں کسی خاص علامت (مثلاً عمامہ یا خاص طرز کی عبا) کا اضافہ کرلیں، کیونکہ اس وقت ان کا ملکی لباس غیر مسلموں کا لباس تھا، اور بغیر کسی شان امتیاز کے اس کو استعمال کرنے کی صورت میں مسلمانوں کی الگ جماعتی زندگی کسی طرح نہیں بن سکتی تھی۔ مگر جب ان ممالک کے سارے باشندے مسلمان ہوگئے، اور انکے ملکی لباس میں وہ اخلاقی و تمدنی اصلاحات نافذ کردی گئیں جنکا اوپر ذکر ہوا ہے، تو انکے مختلف مقامی لباس بعینہٖ اسلامی لباس بن گئے۔ موجودہ زمانہ میں بھی جن ممالک کے تمام یا اکثر باشندے مسلمان ہو چکے ہیں اُن کے ملکی لباس اپنی مختلف وضعوں کے باوجود سب کے سب اسلامی لباس ہیں۔ اور جہاں مسلم اور غیر مسلم آبادی مخلوط ہے، وہاں ہر وہ لباس اسلامی لباس ہے جسے پہن کر ایک مسلمان اور ایک غیر مسلم میں تمیز ہو سکے۔ اور جہاں کی ساری آبادی غیر مسلم ہے وہاں ہر اس شخص کے لیے جو اسلام قبول کرے، یہ ضروری ہے کہ عام غیر مسلموں سے ممتاز ہونے کے لیے اپنی وضع میں کسی ایسی علامت کا اضافہ کرے جو عموماً اسلامی نشان کی حیثیت سے معروف ہو۔

---

[1] ابو داؤد، ترمذی اور مستدرک میں یہ روایت آئی ہے کہ حضور نے فرمایا فرق ما بیننا و بین المشرکین العمائم علی القلانس یعنی "ہمارے اور مشرکین کے درمیان فرق کرنے والی چیز ٹوپی پر عمامہ باندھنا ہے"۔ بعض لوگوں نے اس سے یہ سمجھ لیا کہ یہ تمام مسلمانوں کے لیے دائمی قانون ہے۔ چنانچہ اب بھی بعض لوگ اس فعل کو مسنون قرار دیتے ہیں۔ لیکن یہ محض بے سمجھے حدیث پڑھنے کا نتیجہ ہے۔ دراصل مسنون صرف یہ ہے کہ جب مسلمان کسی ایسی قوم میں ہو جسکے اکثر افراد غیر مسلم ہوں تو وہ اپنے لباس میں آپنے آپکو الگ کوئی امتیازی نشان پیدا کرلے۔

تشبّہ اس مرحلہ پر پہنچ کر ہمارے سامنے تشبّہ کا مسئلہ آجاتا ہے۔ تشبّہ کے معنی ہیں کسی کے مشابہ بننا- اور اس معنی کے لحاظ سے تشبّہ کی چار صورتیں ممکن ہیں جن میں سے ہر ایک کے متعلق اسلام کے رویّہ کی توضیح یہاں کی جاتی ہے:

(۱) صنفی تشبّہ، یعنی مرد کا عورت کے مانند بننا یا عورت کا مرد کے مانند بننا - یہ فعل چونکہ فطرت سے انحراف ہے، اور ایک بگڑی ہوئی ذہنیت کی علامت ہے، اسلیے اسلام اسے ملعون قرار دیتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن مردوں پر جو زنانہ لباس پہنیں اور ان عورتوں پر جو مردانہ لباس پہنیں صاف الفاظ میں لعنت فرمائی ہے اور یقیناً ہر وہ شخص جسکا ذہن صحیح وسلیم ہوگا اس معاملہ میں وہی نقطۂ نظر اختیار کریگا جو اللہ کے نبی کا نقطۂ نظر ہے - مرد میں زنانہ پن اور عورت میں مردانہ پن، خواہ کسی حیثیت سے بھی ہو، ایک نفرت انگیز چیز ہے جسے دیکھ کر طبیعت بےاختیار بغاوت کرتی ہے -

(۲) قومی تشبّہ، یعنی ایک قوم کا بحثیت مجموعی کسی دوسری قوم کی وضع اختیار کرلینا - یہ چیز بھی غیر طبعی اور غیر معقول ہے، اور ہمیشہ ان حالات میں پیدا ہوتی ہے جب کسی قوم میں دنائت کی وبا عام پھوٹ پڑی ہو، لہٰذا اسلام اسکو بھی جائز نہیں رکھتا۔ صحابۂ کرام کے دور میں قومی تشبّہ کی جس طرح روک تھام کی گئی تھی، اور مفتوح ممالک کے باشندوں کو عربیت اختیار کرنے سے جس سختی کے ساتھ منع کیا گیا تھا اس سے صحیح اسلامی روح کا اظہار ہوتا ہے۔

(۳) انفرادی تشبّہ، یعنی کسی قوم کے بعض افراد کا کسی دوسری قوم کی مشابہت اختیار کرنا - یہ دراصل انفرادی سیرت کی کمزوری کا نشان ہے - جو افراد اس قسم کی روش اختیار کرتے ہیں وہ دراصل اس بات کا ثبوت دیتے ہیں کہ انکے نفس میں تلوّن کی بیماری موجود ہے - انکی سیرت میں پختگی اور استحکام نہیں ہے، بلکہ وہ ایک سیال مادّہ کی طرح ہے جو ہر سانچے میں ڈھلنے پر آمادہ رہتا ہے - علاوہ بریں اخلاقی حیثیت سے یہ ایک مکروہ فعل ہے - اسکی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کوئی شخص اپنا نسب کسی دوسرے سے ملائے - جس طرح وہ قابل ملامت ہے، اسلیے کہ اپنی اس حرکت سے دراصل وہ یہ ثابت کرتا ہے کہ اپنے حقیقی باپ کی اولاد ہونے

کو وہ باعث ننگ سمجھ رہا ہے، اسی طرح وہ شخص بھی قابل ملامت ہے جو پیدا تو ایک قوم میں ہو، مگر عزت وافتخار حاصل کرنے کے لیے وضع دوسری قوم کی اختیار کرے، کیونکہ اس طرح وہ دراصل یہ ثابت کرتا ہے کہ جس قوم نے اسے جنم دیا ہے اس سے وابستہ ہونا اسکی نگاہ میں موجب عار ہے اور اسکے نزدیک عزت کی شکل صرف یہ ہے کہ اسکا شمار دوسری قوم میں ہو۔ تمدنی حیثیت سے بھی یہ رویہ سراسر غلط ہے۔ جو لوگ اسے اختیار کرتے ہیں وہ چمگادڑ بن کر رہ جاتے ہیں۔ نہ اس قوم کے رہتے ہیں جس میں پیدا ہوئے ہیں، اور نہ اس قوم کے بن سکتے ہیں جسکے بننا چاہتے ہیں۔ لا الی ھؤلاء ولا الی ھؤلاء۔ انہی وجوہ سے صحابۂ کرام اور خصوصاً حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ نے عرب کے ان افراد کو زجر و توبیخ کی تھی جو بیرونی ممالک میں جاکر عرب کے بدوی لباس چھوڑ بیٹھے تھے اور روم و ایران کے شاندار تمدن سے مرعوب ہوکر ان کے لباس اختیار کر لیتے تھے۔

(۴) تشبُّہ بالکفار، یعنی کسی مسلمان کا غیر مسلم کے مشابہ بننا۔ یہ فعل مسلمانوں کی جماعتی وحدت کے لیے نقصان دہ ہے۔ اسکی وجہ سے مسلمان اور مسلمان کے درمیان اجنبیت پیدا ہوتی ہے اور ان کے باہمی تعلقات میں وہ تعاون و تناصر نہیں ہو سکتا جو اسلام چاہتا ہے کہ ہو۔ یہ اس بات کی علامت بھی ہے کہ ایک شخص مسلمان ہونے کے باوجود غیر مسلموں کی طرف میلان طبع رکھتا ہے۔ اور سیاسی نقطۂ نظر سے بھی یہ حرکت مضر ہے کیونکہ اس میں یہ خطرہ ہے کہ جو شخص غیر مسلموں کے مانند بنا ہوا ہے اسکے ساتھ مسلمان ناواقفیت کی وجہ سے غیر مسلموں کا سا معاملہ کرینگے۔ ان وجوہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار اس قسم کے تشبُّہ کی ممانعت فرمائی ہے۔ خالفوا المشرکین خالفوا الیھود والنصاریٰ۔ خالفوا المجوس۔ یہ الفاظ متعدد احادیث میں ہم کو ملتے ہیں جن سے حضورؐ کا صاف منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان، مسلمان کو دیکھ کر پہچان سکے اور اسکے ساتھ مسلمان کا سا معاملہ کرسکے۔ آپ نے یہ بھی اعلان فرمادیا تھا کہ جو مسلمان غیر مسلموں میں مخلوط ہوکر رہیگا، میں اس سے بری الذمہ ہوں، یعنی اگر کسی جنگ میں مسلمان اسے دشمن کا آدمی سمجھ کر قتل کردیں تو اپنے خون کا وہ خود ذمہ دار ہوگا۔ من تشبہ بقوم فھو منھم کا منشا بھی یہی تھا کہ جو شخص کسی قوم کے مشابہ بن کر رہیگا وہ لامحالہ اسی کا فرد سمجھا جائیگا اور اسکے ساتھ وہی برتاؤ کیا جائیگا جو اس قوم کے دوسرے افراد کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

لا اِلٰہ اِلّا اللہ

(از جناب سیّد محمد نواز صاحب بی۔ اے آنرز)

چو می گویم مسلمانم بلرزم
کہ دانم مشکلاتِ لا الٰہ را

کس آسانی، کس سادگی اور کس لاعلمی سے ہم کلمۂ طیّبہ کو پڑھ جاتے ہیں! گویا ہمارے منہ سے ایک بے ضرر سا جملہ تکیۂ کلام کے طور پر نکل گیا۔ روزمرہ کی زندگی میں ہم خدا جانے کتنی دفعہ اسے کہتے ہیں اور سُنتے ہیں۔ اذان دیتے ہوئے، نماز پڑھتے ہوئے، وضو کرتے وقت، مراقبہ کے اندر، دورانِ تسبیح میں، سونے سے پہلے، جاگنے کے بعد، غرض شائد ہی کوئی ایسا موقع ہوگا جب ہم اسکا ذکر نہ کرتے ہوں۔ جب مرتے ہیں تو یہی پڑھتے ہیں، جب پیدا ہوتے ہیں تو یہی آواز پہلے پہل ہمارے کانوں میں پہنچائی جاتی ہے۔ مگر جس قدر زیادہ ہم اسکا ورد کرتے ہیں اتنا ہی کم اسکے معانی پر غور کرنیکی تکلیف گوارا کرتے ہیں۔ مطالب کی وہ دُنیا جو اِن چار الفاظ میں سمٹی ہوئی ہے ہمارے افقِ نگاہ سے دور ہی رہتی ہے۔

اُن بہت سے "مسلمانوں" کو تو جانے دیجیے جو کلمہ کو جانتے تک نہیں۔ مگر جو جانتے ہیں انکی اکثریت بھی اِس شمشیرِ براں کو اپنی پوری آب و تاب میں دیکھنے سے قاصر ہے۔ انکی آنکھیں بھی اس برقِ جہاں سوز کے آگے خیرہ ہو جاتی ہیں۔ وہ بھی اسی میں اپنی سہولت سمجھتے ہیں کہ اسے طوطے کی طرح بے معنی ہی رٹ لیا جائے، جس طرح ایک تسبیح خواں بعض اوقات بھول جاتا ہے کہ وہ کیا کہے جا رہا ہے۔ وہ اس بات کو محسوس نہیں کرتے، اور شائد محسوس کرتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ اس فیصلہ کن اقرار کا عقلی اقتضاء کیا ہے۔ یہ ان

کے لیے زندگی کے کن راستوں کو بند کرتا ہے، اور کن دوسرے راستوں کی طرف اُسے لے جانا چاہتا ہے۔ دنیا کے ربط و تعلق کی کن صورتوں کو قطع کرتا ہے اور کن دوسری صورتوں کو قائم کرنا چاہتا ہے۔

لفظی ترجمہ تو خیر صاف ہی ہے "کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے" لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ اس جملہ کے مقتضیات اور مطالبات کیا ہیں۔ جس چیز کو ہم اکثر نظر انداز کر جاتے ہیں وہ یہ ہے کہ یہ سادہ سا فقرہ جو ہم کمال بھولے پن سے ہر وقت کہتے رہتے ہیں (حتیٰ کہ بعض جگہ اظہارِ حیرت کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے اور بسا اوقات قسم کھانے کا بھی ایک معمولی ذریعہ ہے) یہ ہمیں کن پابندیوں میں جکڑ لیتا ہے، ورنہ زبان سے صرف ان چار لفظوں کا نکلنا ہم پر کس قدر ذمہ داریوں کا بوجھ ڈال دیتا ہے۔

یہ تو واضح ہے کہ سب سے پہلا فرض جو لا الٰہ الا اللہ پر ایمان لانے والے پر عائد ہوتا ہے یہ ہے کہ وہ شرک نہ کرے یعنی اللہ کے سوا کسی اور کو رب تسلیم نہ کرے، کسی کی خدائی نہ مانے، کسی کے آگے سرِ نیاز نہ جھکائے، عبادت کرے تو اُسی کی، استعانت چاہے تو اُسی سے (اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ)۔ لیکن اس ایمان کے یہ تمام معنوی نتائج جو بیان کیے گئے ہیں، مجمل بلکہ مبہم ہیں۔ اللہ کے سوا کسی کو نہ ماننا، کسی کی خدائی تسلیم نہ کرنا، کسی کے آگے سر نہ جھکانا، کسی کی عبادت نہ کرنا، کسی سے استعانت نہ کرنا، یہ سب مبہم باتیں ہیں۔ ان میں پھیلنے کی استعداد بھی ہے اور سکڑنے کی بھی۔ ان کا پھیلنا اور سکڑنا دراصل اُس آدمی کی نظر پر موقوف ہے جو کلمہ پر ایمان لانے کا ادعا کرتا ہے۔ اُسکی نظر وسیع ہو تو ان مفہومات میں پھیلنے کی اتنی قوت ہے کہ ساری کائنات اور کائنات کے سارے مسائل و معاملات پر پھیل جائیں۔ اُس کی نظر محدود ہو تو ان میں سکڑنے اور سمٹنے کی بھی اتنی قابلیت موجود ہے کہ صرف قول تک یا صرف چند رسمی اعمال تک محدود ہو کر رہ جائیں اور ایک محدود دائرے کے باہر ساری زندگی ان کی گرفت سے آزاد ہو جائے۔

بدقسمتی سے آج کل مسلمانوں کا عام میلان وسعت کے بجائے محدودیت ہی کی طرف ہے۔ ان کا

ہر گروہ اس کلمہ کے کسی ایک محدود معنی پر نظر جمائے بیٹھا ہے۔ وسیع مفہوم کے لیے یا تو ان کے ذہن ہی تنگ ہیں، یا ہمت قاصر ہے اور اسکے نتائج سے یہ لرزہ براندام ہیں۔

مثال کے طور پر علماء کو لیجیے۔ اکثر حضرات شرک، نفاق، انکار، کے وسیع مفہوم سے گریز کرتے ہیں (زہے قسمت!)۔ وہ لسانی ایمان کے زیادہ قائل ہیں۔ اُنکے نزدیک یہ کافی ہے کہ ایک آدمی زبان سے اقرار کرلے کہ "اللہ کے سوا کوئی خدا نہیں"۔ خواہ وہ خدا یا معبود کے مفہوم سے قطعی ناواقف ہو اور نہ جانتا ہو کہ یہ اقرار کرکے وہ دنیا کی تمام ہستیوں سے کیا چیز سلب کر رہا ہے اور اللہ وحدہٗ لاشریک کے لیے کس چیز کو خاص کر رہا ہے۔ خواہ اسکی زندگی بحیثیت مجموعی اور اسکی ایک ایک حرکت یہ ثابت کر رہی ہو کہ اس نے اس کلمہ کے معنی کو جان کر اسکا اقرار نہیں کیا ہے، کیونکہ یہ اقرار کرنے کے بعد اس میں یک سر مو کوئی فرق واقع نہیں ہوا۔ اقرار سے پہلے جیسا تھا اقرار کے بعد بھی ویسا ہی رہا۔ مگر علماء کو اصرار ہے کہ ایسا شخص "مومن" ہے اور دخول جنت کی بشارت اسکو پہنچتی ہے۔ گویا کفر و اسلام کا سارا جھگڑا بس لؔ الفؔ اور ہؔ سے بنے ہوئے ایک چھوٹے سے فقرے کے تلفظ پر ہے۔ جو ان الفاظ کے ساتھ زبان کو جنبش دیکر ہوا میں چند لہریں پیدا کردے گا، اللہ اس خدمت کے صلہ میں اسے جنت عطا فرمائیگا، اور جو ہوا میں یہ لہریں پیدا کرنے سے قاصر رہے گا، اس سے اللہ تعالیٰ اتنا ناراض ہوگا کہ ہمیشہ کے لیے اسے دوزخ میں جھونک دیگا!

صوفی حضرات عموماً اور چیزوں کی طرح کلمہ کو فلسفیانہ رنگ دیتے ہیں۔ "کوئی خدا نہیں سوائے اللہ کے" آہستہ آہستہ "کچھ نہیں سوائے اللہ کے" میں تبدیل ہو جاتا ہے اور بالآخر "ہمہ اوست" کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ ارتقائے معانی کے اس عمل (process) کو وہ اپنی اصطلاح میں "نفی و اثبات" کہتے ہیں۔ گویا پہلے ہر چیز کی نفی کی، بعد میں اللہ کا اثبات کرکے ہر ایک چیز میں اُسی کے نور کی جھلک دیکھنے لگے۔ جہاں تک "نفی و اثبات" کے بنیادی تصور کا تعلق ہے، بلاشبہ وہ کلمہ کے صحیح مفہوم سے

نہایت قریب ہے، بلکہ اسکا منبع ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ "نفی و اثبات" کا ذکر انفرادی طور پر کسی مسلمان کے قلب پر اسرارِ وحدت کا انکشاف تو کرسکتا ہے اور اسے سیر فی اللہ اور سیر مع اللہ اور سیر الی اللہ کی منازل کا سفر بھی کراسکتا ہے، مگر اس رنگین اور دلآویز باطنی سیر میں اتنی قوت نہیں کہ اجتماعی طور پر مسلمانوں کو ایک کارکن جماعت بنا کر انہیں صحیح معنوں میں غیر اللہ کی نفی اور اللہ کا اثبات عملاً قائم کرنے پر ابھار سکے۔ شخصی طور پر وہ آدمی جس نے "نفی و اثبات" کا قلبی ذکر کیا ہو، ممکن ہے کہ وہ توحید ایزدی کی وجد آور کیفیات میں استغراق حاصل کرسکے۔ مگر عملی نقطۂ نظر سے کلمہ کے پورے مقتضیات اُس پر واضح نہیں ہوتے، بلکہ آخر کار "ہمہ اوست" کا تصور خود ہی اسکی بے عملی میں ممد بن جاتا ہے کیونکہ اس دُنیا میں اُسے سوائے اللہ کے کچھ نظر ہی نہیں آتا جس سے اسکو الجھنا پڑے یا جسکے خلاف اُسے واجباً سعی کرنی پڑے۔

لَا کو آپ نفی کہہ دیں یا "تخریب" اور اِلَّا کو اثبات کہیں یا "تعمیر" مدّعا ایک ہی ہے۔ لَا اِلٰہ اس بات کا اعلان ہے کہ دنیا میں کوئی چیز قابلِ تسلیم، لائق اطاعت اور مستحق تقلید نہیں ہے۔ وہ تمام مختلف نظام جو مختلف زمان و مکان میں عقل انسانی (یا جہل انسانی) کے تراشے ہوئے ہیں غلط ہیں آپ کو انہیں مٹانا ہے اور انکی تخریب کرنی ہے۔ اب جو فرد یا جو گروہ "لَا" پر عمل کرنے لگا، سمجھیے کہ اُس نے راہِ توحید پر پہلا قدم اٹھالیا۔ لیکن اب لغزش کا مقام آگیا، جہاں ممکن ہے کہ کسی روس کی، اکروڑ آبادی ساری کی ساری آنِ واحد میں پھسل پڑے، جہاں کسی زار پر لَا کا خطِ تنسیخ کھینچنے کے بعد کوئی لینن یا کوئی سٹالن اسکی جگہ الٰہ بن جائے۔ دنیا کے جدید مذاہب و مسالک اسی غلطی میں گرفتار ہیں۔ کہیں سرمایہ داری کی تخریب ہوتی ہے تو اسکی جگہ زمامِ کار "مزدور" کے ہاتھ میں دے کر گویا ایک لات کی جگہ دوسرے منات کو ملتی ہے۔ کہیں ملوکیت کا بت پاش پاش کیا جاتا ہے تو اسکی جگہ آمریت کا دیوتا بٹھا دیا جاتا ہے۔ اس مشکل مقام پر اس دوراہے پر اِلَّا آکر دُنیا کو سنبھالتا ہے اور حکم دیتا ہے کہ جس خونخوار نمرود کو گراؤ اُسکی جگہ کسی اور بھیس میں ویسا ہی خونخوار فرعون نہ بٹھاؤ، بلکہ اس تخریب کے بعد ایک ایسی عمارت تعمیر کرو جو اللہ کے بنائے

ہوئے طریقہ پر مبنی ہو۔ اگر لا کو آپ اِلّا سے علیحدہ کردیں تو گویا چنگیز کی جگہ کسی ہلاکو کے لیے خالی کر رہے ہیں :-

نہادِ زندگی میں ابتدا لا انتہا اِلّا
پیامِ موت ہے جب لا ہوا اِلّا سے بیگانہ

وہ ملت روح جسکی لا سے آگے بڑھ نہیں سکتی
یقیں جانو ہوا لبریز اُس ملت کا پیمانہ

اب ایک منٹ کے لیے تصور کیجیے کہ دنیا کی جو قومیں محض لا الٰہ کے پھیر میں پڑی ہوئی ہیں اگر وہ اِلّا اللہ پر بھی عامل ہوجائیں تو کیا اس جہانِ پیر کی تقدیر بدل نہیں سکتی ؟ یہ اِلّا انکو ایک ایسی لڑی میں پروئے ، ایک ایسے نظامِ واحد میں منسلک کرے کہ انکی باہمی تخریب ، انکی تہذیبی ، تمدنی ، معاشی ، نسلی ، قومی ، سیاسی ، طبقاتی نزاعیں ، انکی خودکشی کی کوششیں سب ختم ہوجائیں ۔ انکی ہوسناکیاں ، جوع الارض کے لیے مکاریاں ، ریاکاریاں اور منافقتیں سرے سے مٹ جائیں ۔

یہ تو خیر دور کی بات ہے ۔ دوسروں کو سمجھانے سے پہلے ذرا اپنے آپ کا محاسبہ کریں ۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم ابھی مقام "لا" سے بھی کوسوں دور ہوں ۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ عملی طور پر تو ہم صنم پرستی کر رہے ہوں اور زبان سے یہ کہتے پھرتے ہوں کہ لا اِلٰہ اِلّا اللہ ۔ جونہی اپنے گریبان میں منہ ڈالیں گے عجیب تماشا نظر آئیگا ۔ ہم میں جو ناخواندہ طبقہ ہے ان کا سب سے بڑا بُت جہالت کا بت ہے یہ خدا انہیں بہت عزیز ہے ۔ اوّل تو انہیں وسائل ہی مہیّا نہیں اور اگر ہوں بھی تو اُنکے لیے تعلیم دینی اپنے اندر اتنی جاذبیت بھی نہیں رکھتی کہ وہ تفحص کریں کہ آخر ہم دن میں پانچ دفعہ نماز کے اندر اللہ سے کیا کہتے ہیں ۔ انکی عمریں نمازیں پڑھتے گذر جاتی ہیں اور قُل ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ کے معنی نہیں آتے یہ خبر نہیں ہوتی کہ سُبحانَ ربی الاعلیٰ کا مفہوم کیا ہے ۔

اس بڑے بُت کے جلو میں اور بہت سے بت ہیں ۔ اللہ کے بعض نیک بندوں کو چھوڑ کر چھوٹے پیروں کے لشکر کے لشکر پھر رہے ہیں جو عوام کی بڑی تعداد کو اپنے دامِ تزویر میں پھنسائے ہوئے ہیں

اور نہیں چاہتے کہ علم وبصیرت کی روشنی اِن غریبوں تک پہنچ سکے ۔ یہ پیر "ہمہ اوست" کی آڑ میں خدائی تک کے دعویدار بن جاتے ہیں اور اپنے مریدوں کے قویٰ پر ایک ایسا جمود طاری کرتے ہیں کہ اُن کے اعضاء تیزاب "الست" میں مضمحل ہو کے رہ جاتے ہیں۔

اِنکے علاوہ جاہل ملاؤں، ذاکروں، مجتہدوں، رئیسوں اور نوابوں کی تعداد ہے جو لوگوں کو اپنے آگے جھکواتے ہیں اور انکی جہالت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اپنے حلقہ اثر میں خدائی کا کھلا یا چھپا اعلان کر رہے ہیں۔ یہ سب کچھ صرف اس وجہ سے ہے کہ بندے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ کو نہیں جانتے۔ یہی کلمہ جو مالک اور حاکم کو متعین کرتا ہے، اصل میں مملوک اور محکوم کو بھی اسکے اصلی مقام سے آگاہ کرتا ہے یعنی اگر خدا کی یہ شان ہے کہ اسکے سوا کوئی فرماں روا نہیں، تو انسان کی بھی یہ شان ہے کہ اس کا سر تسلیم خدا کے سوا کسی بناوٹی فرماں روا کے آگے جھک نہیں سکتا۔ چنانچہ اگر آپ دنیا کے سب سے زیادہ منکسر اور سب سے زیادہ متکبر شخص کو دیکھنا چاہتے ہوں تو اُس کو دیکھیں جو اللہ کے آگے جھکا ہوا اپنی جبینِ نیاز زمین پر رکھے ہوئے ہو۔ یہ ایسا نیاز ہے کہ کوئی ناز اسکے آگے ٹھیر نہیں سکتا۔ اسلئے کہ وہ آدمی جو خدا کے سامنے جھک رہا ہے ایک طرف اپنی کمال عبودیت اور عجز کا اظہار کر رہا ہے اور دوسری طرف یہ بھی بتلا رہا ہے کہ اے خدا یہ گردن صرف تیرے ہی آگے جھک سکتی ہے، اگر کائنات کی کوئی اور طاقت یا تمام طاقتیں مل کر بھی اسے جھکانا چاہیں تو یہ خم نہ ہو سکے گی۔ اللہ کی اطاعت غیر اللہ سے بغاوت کا دوسرا نام ہے۔ پس خدا کی پہچان انسان کو لازمی طور پر خود اپنے مقام سے بھی آگاہ کرتی ہے۔ اسی کے فقدان کو مودودی صاحب نے " خدا فراموشی و خود فراموشی" کہا ہے۔ اور اسی اثر کے تحت اقبال حضورِ رسالت میں عرض رساں ہیں:

نہ با ملّا نہ با صوفی نشینم — تو میدانی کہ من آنم نہ اینم
نویس اللہ بر لوحِ دلِ من — کہ ہم خود را ہم او را فاش بینم

اب عوام کو چھوڑ کر خداخواندہ حضرات کی طرف آیئے۔ ان میں سے بعض تو اشتراکیت کو دنیا کی نجات کا ذریعہ سمجھ کر اسلام سے مایوس ہو رہے ہیں۔ اور بعض ایسے ہیں جو وطنیت کے جذبہ میں سرشار پکار پکار کر کہتے پھرتے ہیں کہ "ہم مسلمان نہیں ہیں بلکہ ہندوستانی ہیں"۔ انکا دین بھی وطن اور خدا بھی وطن ہے:۔

تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور

اِن تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے

جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے!

جو اس خدا کی پرستش سے بچے وہ "قومیت" کے نظر فریب جال میں اُلجھ گئے۔ ان سب کا مشترک بت کدہ "مغربیت" ہے جس میں بے شمار بت رکھے ہوئے ہیں اور ان میں سے ہر ایک اس کے بتوں میں سے کسی نہ کسی کے آگے سر بسجود ہے۔ پھر ایک اور "خدا"، اور بعض کے لیے سب سے بڑا "خدا" انگریز ہے جسکے سامنے بندوں اور پرستاروں کا ایک جمگھٹا لگا ہوا ہے اور ان میں عالم و جاہل سب ہی قسم کے لوگ نظر آتے ہیں:۔

سجودے آوری دارا و جم را مکن اے بے خبر رسوا حرم را

مبر پیشِ فرنگی حاجتِ خویش زطاقِ دل فرو ریز ایں صنم را

اب انصاف سے کہیئے جس قوم کے استنے "خدا" ہوں اُسے کیا حق ہے کہ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ کہے؟ اُسے تو یہ کہنا چاہیئے کہ اللہ کے سوا باقی سب خدا ہیں، تب وہ سچ کہہ رہی ہوگی۔ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ کا تو منشا یہ ہے کہ خدائی یعنی بادشاہت صرف اللہ کی مانی جائے۔ پس یہ سچائی نہیں ہے کہ عمل میں اور واقعہ میں تو "خدائی" کسی اور کی تسلیم کی جائے اور زبان سے کہا یہ جائے کہ اللہ کے سوا کوئی خدا نہیں۔

جب ہم یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں، تو اس کا مطلب صرف یہی نہیں ہوتا کہ اس کے

سوا کوئی مسجود و معبود (object of worship) نہیں ہے اور کوئی اس لائق نہیں ہے کہ اس سے دعا مانگی جائے یا اسکے آگے نذر و نیاز پیش کی جائے، بلکہ اس سے یہ مراد بھی ہوتی ہے کہ اس کے سوا کوئی مالک نہیں، کوئی بادشاہ نہیں، کوئی حاکم نہیں۔ اسکے سوا کوئی نہیں جسکے حکم کو بے چون و چرا مان لیا جائے۔ اس کے سوا کوئی نہیں جسکے قانون کو قانون تسلیم کیا جائے۔ اسکے سوا کوئی نہیں جسکو انسان اپنے سے بالاتر سمجھے اور جسکے آگے ذلت، غلامی، نیازمندی اور محکومی اختیار کرے۔ اسکے سوا کوئی نہیں جو حکمت و دانائی کا منبع ہو اور جسکو حقیقت و صداقت کے علم کا آخری ماخذ سمجھا جا سکے۔ اسکے سوا کوئی نہیں جو منتہائے کلام ہو، یعنی جسکے فیصلہ پر کسی کو کلام کرنے کا حق نہ ہو۔ تنہا وہی اس کا حقدار ہے کہ انسان اسکی اطاعت کرے۔ تمام اطاعتیں اسکی اطاعت کے ماتحت اور اسکی اطاعت کی شرط سے مشروط ہیں۔ ماں، باپ، استاد، مرشد، حاکم غرض جو کوئی بھی ہو، اسکی اطاعت خدا کی اطاعت کے تابع ہوگی۔ جو اسکی اطاعت سے آزاد ہے اسکی اطاعت سے ہم آزاد ہیں۔ یہ سب اللہ کو الٰہ واحد تسلیم کرنے کے لوازم ہیں۔ جو شخص ان میں سے کسی حیثیت سے بھی اللہ کو الٰہ تسلیم نہیں کرتا وہ دہریہ ہے۔ اور جو بعض حیثیتوں سے اسکو الٰہ مانتا ہے اور بعض حیثیتوں میں دوسروں کو اس کا شریک یا حصہ دار بناتا ہے وہ شرک کا مرتکب ہے۔ صرف غیر کو سجدہ کرنا یا غیر سے دعا مانگنا یا غیر کے آگے نذر و نیاز پیش کرنا ہی شرک نہیں ہے، بلکہ شرک کی اور بھی بہت سی صورتیں ہیں۔ جب ہم کسی انسان کے آگے ہاتھ باندھے نظریں جھکائے کھڑے ہونگے اس وقت ہم شرک کر رہے ہونگے۔ جب کسی کو نفع و ضرر سمجھ کر اس سے طمع یا خوف کرینگے تو شرک کرینگے۔ جب کسی کو اپنی جان و مال کا مالک سمجھینگے تو شرک کرینگے۔ جب کسی کو مطاعِ مطلق اور بالذات صاحب امر و نہی سمجھینگے تو شرک کرینگے۔ جب اللہ کے سوا کسی اور کی طرف راہِ راست معلوم کرنے کے لیے رجوع کرینگے یا کسی اور کو ہدایت اور حکمت و دانش کا ماخذ سمجھینگے تو دراصل اسے خدا مانیں گے۔ جب کسی لیجسلیچر یا پارلیمنٹ یا فرد واحد کو قانون بنانے کا مختار سمجھینگے، یا کسی کی اس حیثیت کو تسلیم کرینگے کہ اسکی رضا (sanction) سے قانون بنتا ہے تو دراصل اسے

خدا تسلیم کرینگے۔ غرض شرک کے حدود اتنے تنگ نہیں ہیں جتنے لوگوں نے سمجھ رکھے ہیں، اور توحید الٰہ کی وسعت اتنی محدود نہیں ہے جتنی آج کل عام طور پر مسلمانوں کے گمان میں ہے۔ بلکہ دراصل اسکے حدود بہت وسیع ہیں۔ زندگی میں ہر ہر قدم پر ہمارے سامنے یہ سوال آتا ہے کہ ہم اللہ کو الٰہ مانتے ہیں یا کسی اور کو۔ ان تمام مواقع پر ہر ایک کی الٰہیت سے انکار اور صرف خدا کی الٰہیت کا اعتقادی و عملی اقرار توحید ہے۔ اور جہاں کسی رنگ میں بھی کسی دوسرے کی الٰہیت مان لی وہیں شرک ہوگیا۔ یہی چیز تو ہے جسکی وجہ سے مسلمان ہونا دنیا میں سب سے زیادہ سخت اور مشکل کام ہے۔ ورنہ اگر بات صرف اتنی ہوتی کہ کسی اور کو سجدہ نہ کرو اور کسی اور سے دعا نہ مانگو، تو کوئی بڑی مشکل نہ تھی۔

اب رہا یہ سوال کہ خدا کی اطاعت اور اسکے قانون کی پیروی کس طرح کی جائے، تو اس معاملہ میں ہم آزاد نہیں ہیں کہ جس چیز کو چاہیں خدا کا حکم اور قانون ٹھیرالیں اور اسکی پیروی کریں۔ بلکہ اس علم کا ذریعہ ہمارے لیے صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے۔ اسی لیے "محمد رسول اللہ" کلمہ کا ضروری جزو قرار دیا گیا تاکہ یہ تعین کردے کہ اللہ کا راستہ وہ ہے جو اُس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیج کر انکے ذریعے سے بتلایا۔ گویا کلمہ نہ صرف وحدتِ الوہیت کا اعلان ہے بلکہ وحدتِ امامت کا بھی۔ پھر وہ تمام انسان جو اس پر ایمان لائیں ایک امت ہیں، اس طرح وحدتِ امت بھی اسی میں آگئی۔ اور چونکہ غریب و امیر، راعی و رعایا سب یکساں طور پر اُس ایک خدا کے بندے ہیں اور کوئی کسی کا بندہ نہیں ہے اس لیے مساوات، اخوت، حریت، انسداد برہمنیت و پاپائیت، حرمتِ ملوکیت، غرض اسلام کے تمام اصول اِن جامع الفاظ میں موجود ہیں۔ اور چونکہ لا الٰہ الا اللہ پر ایمان لاتے ہی آدمی پر ہر غیر الٰہی نظام کی (خواہ وہ سیاسی ہو یا مذہبی یا معاشرتی یا کوئی اور) تخریب اور اسکی جگہ ایک الٰہی نظام کی (جو زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہو) تعمیر لازم ہوجاتی ہے لہٰذا جہاد بھی اسی میں آگیا۔

پس اللہ کی خدائی پر ایمان درحقیقت اسی جگہ ہوگا جہاں قرآن کی حکومت ہو، جہاں تشریعت

محمدیہ کے قانون نافذ ہوں، جہاں لوگوں کی زندگیاں احکامِ قرآنی کے مطابق بسر ہوتی ہوں، اور جہاں اللہ کے سوا کوئی کسی حیثیت سے بھی الٰہ نہ مانا جاتا ہو۔ مگر جہاں یہ سب کچھ نہ ہو، جہاں قرآن کی بجائے "تعزیرات ہند" پر عمل ہو رہا ہو، جہاں محمد کی عدالت کی بجائے "جارج ششم" کی عدالتیں قائم ہوں، جہاں کفر کی شریعت نافذ ہو، مجھے بتلایئے وہاں یہ کہنا کہ "اے اللہ ہم تو تجھے ہی اپنا اصلی بادشاہ مانتے ہیں، تیرے ہی آگے جھکتے ہیں، محض تیری حکومت تسلیم کرتے ہیں"، کیا یہ جھوٹ نہ ہوگا؟ کیا یہ خدا فریبی اور خود فریبی نہ ہوگی؟ قرآن کہہ رہا ہے چور کا ہاتھ کاٹ دو، انگریز کا قانون کہتا ہے نہیں اُسے صرف سال چھ مہینے کے لیے جیل بھیج دو۔ قرآن زانی کو سنگسار کراتا ہے۔ انگریز کے نزدیک زنا کوئی گناہ ہی نہیں بلکہ اُلٹا رجم کرانیوالا پھانسی پر چڑھا دیا جائیگا۔ قرآن کہتا ہے کہ سود باطل ہے۔ انگریز کہتا ہے نہیں سود حق ہے، نہ دوگے تو زبردستی دلایا جائیگا۔ یہ صرف چند مثالیں ہیں۔ ورنہ زندگی کا کونسا معاملہ ہے جس میں انگریز کا قانون خدا کے قانون سے متصادم نہیں ہوتا۔ مگر ہم نہ صرف یہ کہ خدا کے قانون کے مقابلہ میں انگریز کے قانون کو قانون تسلیم کر رہے ہیں، بلکہ اپنے معاملات کو اسی قانون کے مطابق طے کرانے جاتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ ہمارے بہت سے بھائی جو خدا کے قانون پر ایمان لانے کا دعویٰ کرتے ہیں، وہی روزانہ عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر انگریز کے قانون کے مطابق فیصلے کرتے ہیں۔ اور بہت سے مدعیانِ ایمان بلکہ محافظینِ اسلام تک روٹی ہی اس بات کی کھاتے ہیں کہ انگریز کے قانون کے مطابق لوگوں کے مقدمات کی وکالت کریں۔ ان سب باتوں کے بعد جب لا الٰہ الا اللہ کہا جاتا ہے تو خدارا بتایئے کہ یہ خدا کے ساتھ مذاق کرنا یا اپنے نفس کو فریب دینا نہیں تو اور کیا ہے؟

مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جب کوئی کلمۂ شہادت پڑھتا ہے اور کہتا ہے کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی خدا نہیں، تو یا تو وہ اسے سمجھتا ہی نہیں اور یا جان بوجھ کر جھوٹ بول رہا ہے۔ اگر اُسکو یقین ہو کہ اللہ کے سوا حقیقت میں اس کا کوئی الٰہ نہیں ہے تو وہ تمام ایسی حکومتوں اور بادشاہوں

سے، جو غیر اللہ کی ہوں، ٹکرائے گا اور یا انہیں پاش پاش کر دے گا یا خود پاش پاش ہو جائیگا۔ بہر حال غیر خدا کی خداوندی و حاکمیت کے آگے سرِ تسلیم خم کر دینا اور غیر الٰہی نظام کو چلانے میں حصہ لینا اور پھر اس خدمت کی روٹی کو مزے سے کھانا اور ہضم کرنا، اور پھر ان سب حرکتوں کے ساتھ اسلام اور اسلامی کلچر کی حمایت و حفاظت کے دعوے لے کر اٹھنا، یہ ایسی بدترین منافقت ہے جسے گوارا کرنے کی تاب کوئی مومن تو نہیں رکھ سکتا۔

لا الٰہ الا اللہ محض ایک جملہ نہیں ہے۔ بلکہ اعلان ہے، چیلنج ہے اس بات کا کہ اے دنیا والو، تم نے جو سیاست، معیشت، تمدن اور معاشرت کے نظام احکامِ الٰہی کے خلاف قائم کر رکھے ہیں، مسلمان ان سب کو توڑنا چاہتا ہے۔ جو خود تراشیدہ بُت تم پوجتے ہو، مومن انہیں پاش پاش کرنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ وہ محض اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کر سکتا ہے۔ باقی تمام مطاعوں کی اطاعت اور تمام اماموں کی امامت کو اُسے ختم کرنا ہے:

صنم کدہ ہے جہاں اور مردِ حق ہے خلیلؑ
یہ نکتہ وہ ہے کہ پوشیدہ لا الٰہ میں ہے

لیکن اگر اپنے آپ کو مسلمان کہلانے والا غیر الٰہی نظامِ زندگی پر رضامند ہے، اگر وہ "مصلحتِ وقت" کا بندہ بنا ہوا ہے، اور وہ اربابٌ من دون اللہ کو برباد کرنے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ کفر کی اطاعت کو گوارا کرتا ہے تو یقیناً وہ جتنی مرتبہ زبان سے کلمۂ پاک کا ورد کرے گا اتنی ہی مرتبہ ناپاک جھوٹ بولے گا۔ جس حال میں ہم آج کل کلمہ پڑھتے ہیں اور لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ کا ہر مسجد سے ہر روز دن میں پانچ بار اعلان کرتے ہیں، اگر ہم اسکا مطلب سمجھتے تو یا تو یہ کہنا ہی چھوڑ دیتے کیونکہ کفر کی غلامی میں رہ کر ہمیں یہ پکارتے ہوئے شرم آتی کہ "اے دنیا والو، سن لو۔ ہم اللہ کے سوا کسی کی حکومت کو نہیں مانتے، ہمارا فرمانروا اور واحد صرف اللہ ہے، اسکے سوا ہم تمام بادشاہتوں کو توڑنے آئے ہیں"۔

اور یا پھر مردانہ وار تمام دنیاوی خداؤں کا تختہ اُلٹنے کے لیے کھڑے ہو جاتے تب تو ہماری لا الٰہ الا اللہ
کی آوازیں بالکل ایسی ہیں جیسے سپین کے شکست خوردہ مسلمانوں کے "اللہ اکبر" کے نعرے تھے وہ
نعرے بے سود تھے کیونکہ زبان سے تو وہ کہہ رہے تھے کہ اللہ سب سے بڑا ہے، مگر اصل میں اُن کے لیے
ان کے نفس کا شیطان سب سے بڑا ہو چکا تھا، اور اُس کے بعد اگر کسی کی بڑائی ان کے دلوں میں بیٹھی ہوئی
تھی تو وہ عیسائی حملہ آوروں کی بڑائی تھی سو یہی حال آج ہمارا بھی ہے - زبانوں سے کہہ رہے ہیں
لا الٰہ الا اللہ مگر دلوں میں غیروں کی تعلیم، مدنیت، زبان، تاریخ، ہر چیز سے مرعوب ہو چکے ہیں -
کبھی اس ازم (ism) کی پناہ لیتے ہیں اور کبھی اُس مہاتما کے دامن میں جا چھپتے ہیں، کبھی
وائسریگل لاج کو قبلہ بناتے ہیں اور کبھی آنند بھون کو:

بتوں سے تجھ کو امیدیں، خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے؟

فسطائیت، اشتراکیت، الحاد، مادّیت، دہریت، کے طوفان کرۂ ارضی پہ اُمڈے چلے
آتے ہیں - انکے جلو میں بحری بیڑے ہیں، ہوائی جہاز ہیں، ٹینک ہیں، زہریلی گیسیں ہیں، آتش افروز بم ہیں
مشین گنیں ہیں، جنکے گولوں کی مہیب آوازیں سینۂ کائنات میں ہیجان برپا کر رہی ہیں، جن کی گرج اور
کڑک سے دنیا تھرتھرا رہی ہے، جنکے سرخ سرخ کوئلے کی حرارت سے ہماری یہ ٹھوس زمین پگھلی چلی جا رہی ہے
ابلیسی طاقتیں پورے کرّوفر سے یزدانی قوتوں سے برسرپیکار ہیں - "شرار بولہبی" پوری تندی سے "چراغ
مصطفوی" کے ساتھ ستیزہ کار ہے - دیکھیں اس کشمکش میں نیابت الٰہی کا واحد علمبردار کیا کر دکھاتا ہے -

دنیا کو ہے پھر معرکۂ روح و بدن پیش
تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو اُبھارا
اللہ کو پامردیٔ مومن پہ بھروسا
ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا
تقدیرِ امم کیا ہے، کوئی کہہ نہیں سکتا
مومن کی فراست ہو تو کافی ہے اشارا

معارف القرآن

دلیل نبوت

از جناب مولانا سید صبغۃ اللہ بختیاری

[ہمارے مکرم مولانا سید صبغۃ اللہ صاحب استاذ جامعہ دار السلام عمر آباد "اقسام القرآن" کے نام سے ایک کتاب تالیف فرمارہے ہیں جس میں ان مقامات کی تشریح کی گئی ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے کسی چیز کی قسم کھائی ہے۔ یہ مضمون اسی کتاب کا ایک باب ہے۔ اس میں ان آیات کی تفسیر ہے جن میں قرآن مجید کی قسم کھائی گئی ہے]

سورۂ یٰسین مکہ میں نازل ہوئی ہے اور مکی سورتوں کے طرز بیان کے مطابق اس میں بھی اسلامی اصول وعقائد اور دین فطرت کے بنیادی امور کی تلقین کی گئی ہے اور خصوصاً رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت و نبوت پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔ سورہ کا آغاز ان الفاظ کے ساتھ ہوتا ہے:۔

يٰسٓ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ اِنَّكَ لَمِنَ
الْمُرْسَلِيْنَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ
الرَّحِيْمِ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ
غٰفِلُوْنَ لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلٰٓى اَكْثَرِهِمْ
فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ۔ (یٰسین-۱)

حکمت والے قرآن کی قسم کہ (اے محمدؐ!) تم یقیناً خدا کے پیغمبروں میں سے ہو۔ سیدھے راستے پر ہو (یہ قرآن) زبردست (اور) بڑے مہربان (خدا) کی طرف سے اتارا ہوا ہے تاکہ تم (اس کے ذریعہ سے) ایسی قوم (والوں) کو متنبہ کرو جن کے آباؤ اجداد کو (ان کے برے اعمال کے نتائج سے) نہیں ڈرایا گیا، پس یہ لوگ (اسی وجہ سے) غفلت میں پڑے ہیں۔ یقیناً ان میں سے اکثر لوگوں پر یہ چیز واضح ہو چکی ہے۔ (پھر بھی عناد نفسانیت

کے سبب سے) یہ لوگ ایمان نہیں لاتے۔

ان آیات میں خدائے تعالیٰ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر قرآن کی قسم کھائی ہے اور یہ بات ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ ایک دعوے کی صداقت پر جب کسی خاص چیز کی قسم کھائی جاتی ہے تو اُس کا مطلب دراصل یہ ہوتا ہے کہ اس خاص چیز میں اس دعوے کی صداقت کے لیے دلیل موجود ہے گویا مقسم علیہ اور مقسم بہ میں وہی مناسبت ہوتی ہے جو دعوے اور شہادت کے درمیان ہوا کرتی ہے۔ پس یہاں قرآن کی قسم کھانے کا مطلب یہ ہے کہ یہ کتاب اپنی شانِ اعجاز، اپنی حکیمانہ تعلیمات اور اپنے معارف و حکم کی وجہ سے اس بات پر کھلی گواہی دے رہی ہے کہ آپ خدا کے سچے رسول اور برگزیدہ نبی ہیں۔

کفار و مشرکین کو آپ کی رسالت پر سب سے بڑا شبہ یہ تھا کہ بھلا ہم ہی جیسا ایک انسان جو کھاتا بھی ہو اور پیتا بھی، جو ہماری طرح بازاروں میں چلتا پھرتا ہو، شادی بیاہ کرتا ہو، صاحب اولاد ہو اور جس کو عام انسانوں کی طرح تمام انسانی لوازم و حوائج لاحق ہوتے رہتے ہوں، کیونکر ممکن ہے کہ وہ اللہ کی طرف سے رسول بنا کر بھیجا جائے۔ چنانچہ قرآن عزیز میں اُن کے اس خیالِ باطل کا متعدد مرتبہ ذکر فرمایا گیا ہے۔

الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ اَكَانَ	یہ حکمت والی کتاب کی آیتیں ہیں۔ کیا لوگوں کو (اس بات پر)
لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ	تعجب ہوا کہ ہم نے انھیں میں کے ایک انسان پر وحی اتاری
اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا	تاکہ وہ ڈرائے (اپنی قوم) کے لوگوں کو اور ایمان والوں کو
اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ قَالَ	خوش خبری سنا دے کہ ان کے پروردگار کے پاس ان کے لیے بلند مرتبہ
الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ (سورۂ یونس ۱)	ہے۔ (تو) کافروں نے کہا کہ بے شک یہ کھلا جادوگر ہے۔

اسی طرح سورۂ اعراف میں حضرت نوح علیہ السلام کی رسالت کو جھٹلانے اور انکار کرنے والوں کی طرف خطاب کر کے فرمایا گیا ہے۔

أَوَعَجِبْتُمْ أَنْ جَاءَكُمْ ذِكْرٌ مِنْ — کیا تم نے اس پر تعجب کیا کہ تمہارے پروردگار کی طرف سے

رَبِّكُمْ عَلَىٰ رَجُلٍ مِنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ (اعراف) — تمہارے پاس ایک نصیحت آئی تمہیں میں سے ایک شخص کے ذریعہ سے

تاکہ وہ تم کو (برے اعمال کے نتائج و عواقب سے) ڈرائے؟

ایک اور جگہ منکرین رسالت کے فاسد خیالات کو اللہ تعالیٰ نے حکایۃً ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

مَا هَٰذَا إِلَّا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ يَأْكُلُ مِمَّا — اور یہ کچھ نہیں مگر تم ہی جیسا ایک آدمی۔ وہی کھاتا ہے

تَأْكُلُونَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُونَ — جو کچھ تم کھاتے ہو اور پیتا ہے جو کچھ تم پیتے ہو۔ اور اگر تم نے

وَلَئِنْ أَطَعْتُمْ بَشَرًا مِثْلَكُمْ إِنَّكُمْ إِذًا — اپنے ہی جیسے ایک آدمی کا کہنا مان لیا تو تم بیشک ناکام

لَخَاسِرُونَ (مومنون-۲) — رہے۔

انہوں نے یہ خیال کر لیا کہ اللہ کی طرف سے دنیا میں انسانوں کی رہنمائی اور اصلاح روحانی کے لیے مبعوث ہونے والے انبیاء و رسل انسان نہیں ہو سکتے بلکہ ان کو انسانوں کے بجائے کچھ اور ہی ہونا چاہیے۔ یا تو وہ فرشتہ ہو یا کم از کم اس کے ساتھ کوئی فرشتہ ہمیشہ لگا رہے جو اس کی پیغمبری کا چاردانگ عالم میں نقارہ بجائے اور اعلان کرتا پھرے۔ ان کی اس زعم باطل کو ان الفاظ میں نقل کیا گیا ہے۔

وَقَالُوا مَالِ هَٰذَا الرَّسُولِ يَأْكُلُ — اور انہوں نے کہا کہ یہ کیسا رسول ہے جو کھانا کھاتا ہے اور

الطَّعَامَ وَيَمْشِي فِي الْأَسْوَاقِ لَوْلَا أُنْزِلَ — بازاروں میں پھرتا ہے؟ کوئی فرشتہ اس کی طرف کیوں نہیں

إِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُونَ مَعَهُ نَذِيرًا (فرقان-۱) — اترا کہ ڈرانے کیلیے اس (رسول) کے ساتھ ساتھ رہتا؟

اللہ تعالیٰ نے ان کے اس شبہ کو نقل کر کے یہ بتایا ہے کہ انسانوں کی رہبری فرشتے نہیں کر سکتے کیونکہ انسان فرشتوں کا ہم جنس نہیں ہے۔ وہ ان کی زندگی سے دنیا میں استفادہ نہیں کر سکتا۔ اسی لیے منصب رسالت پر خدائے عزوجل کی طرف سے اللہ تعالیٰ انسانوں ہی میں سے ایک انسان کو ما

فرماتا ہے۔ بالفرض اگر فرشتہ کو رسول و نبی بنا کر بھیجا بھی جاتا تو ضرور تھا کہ اسے بشری جامہ پہنایا جاتا اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں پھر ان کو وہی شبہ پیش آتا جواب آرہا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ (انعام۔۱)

اور اگر ہم کسی فرشتہ کو رسول بنا کر بھیجتے تو اُسے بھی آدمی ہی کی صورت میں بناتے، اور (اس طرح) ہم ان کو پھر اسی شبہ میں ڈال دیتے جس میں وہ اب پڑے ہیں۔

ایک دوسری جگہ خداوند پاک نے یہ بھی پورے طور پر واضح فرمادیا ہے کہ کافروں کی فرمائش کے موافق فرشتوں کو اگر ان کے پاس بھیج بھی دیا جاتا اور انھیں ہر ایک نشانی دیدی جاتی پھر بھی نفسانیت رکھنے والے معاندین ایمان نہ لاتے کیونکہ ان کا اصلی مقصود کسی دلیل کا مطالبہ یا حق و صداقت کی جستجو اور تلاش نہیں ہے بلکہ محض حق سے منہ موڑنے کے لیے بہانہ درکار ہے:۔

وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَا اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ (انعام۔۱۴)

اور اگر ہم ان پر فرشتے اتارتے اور اُن سے مُردے باتیں کرتے اور ہم (غیب کی) ہر چیز کو اُنکے سامنے علانیہ نمایاں کردیتے تب بھی یہ لوگ ہرگز ایمان نہ لاتے۔ الا یہ کہ اللہ چاہے۔ لیکن اکثر ان میں جاہل ہیں۔

اس شبہ کا جواب دیدیا گیا تو کفار نے کہا کہ اچھا انسان ہی نبی سہی مگر اس کے ساتھ کوئی ایسی نمایاں نشانی تو ہونی چاہیے جس سے ہم جان سکیں کہ یہ نبی ہے "نشانی" سے ان کا مقصد یہ تھا کہ کوئی ایسا محسوس کرشمہ دکھایا جائے جو خارق عادت ہو۔ مگر جب کبھی انہوں نے کوئی نشانی مانگی ان کو یہی جواب دیا گیا کہ اس نبی کی نبوت کے لیے یہ قرآن ہی کافی ثبوت ہے۔ اگر سمجھ بوجھ رکھتے ہو تو اس کے بعد تمہیں کسی دوسری نشانی کی حاجت ہی نہیں:۔

اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ

کیا ان کے لیے یہ کافی نہیں ہے کہ ہم نے تم پر یہ کتاب

الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (عنکبوت-۵)

نازل کی ہے جو ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہے۔ بیشک اس میں رحمت ہے اور یاد دہانی ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان والے ہیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کفار مکہ آپکے رسول ہونے پر نشانیاں اور معجزات مانگتے رہتے اور اس کے جواب میں ہمیشہ قرآن ہی کی طرف اشارہ کیا جاتا رہا کیونکہ عقل رکھنے والوں کے لیے اس سے بہتر کوئی دلیل نہیں ہوسکتی۔ یہ ایک امی پر نازل ہوا ہے۔ ایک ایسے شخص کی زبان سے ظاہر ہوا ہے جس نے کسی قسم کے صناعی علوم وفنون اکتسابی طور پر حاصل نہیں کیے تھے۔ کہیں کسی معلم سے الٰہیات، اجتماعیات، تاریخ اقوام، علم السیاست، اور اصول قانون کی تعلیم نہیں پائی تھی۔ اور باوجود اس کے وہ ایسی کتاب پیش کر رہا ہے جو حقائق و معارف سے لبریز ہے اور علم وحکمت کے اس انتہائی مرتبہ پر پہنچی ہوئی ہے جس تک کوئی انسان نہیں پہنچ سکتا۔ بس یہی ایک نشانی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر برہان قاطع ہے۔ اس کتاب کی جامعیت اور اس کا زمان و مکان کی حدود سے مبرا ہو کر مطلقاً انسان من حیث الانسان کی سعادت سے بحث کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ آپ کسی خاص زمانے اور کسی خاص ملک یا قوم کے لیے نہیں بلکہ ساری دنیا میں بسنے والے انسانوں کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ خواہ کوئی براعظم ایشیا کا رہنے والا ہو یا سرزمین یورپ کا، خواہ افریقہ کے صحراؤں کا ہو، یا ہندوستان کا، چینی ہو یا جاپانی، ترکی ہو یا ایرانی، دنیا کے کسی قطعۂ زمین کا رہنے والا کیوں نہ ہو آپ اس کے لیے بھی ایسے ہی رسول ہیں جس طرح "ام القریٰ" اور اس کے اردگرد کے واسطے ہیں۔ چنانچہ آپ کی عمومیت دعوت کو فرمایا گیا ہے۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا (اعراف-۲)

(اے نبی) کہہ دو کہ لوگو! تم سب کی طرف میں اللہ کا رسول ہوں۔

دوسری جگہ ارشاد ہو رہا ہے۔

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ (اے پیغمبر) آپ کو ہم نے تمام (دنیا کے) لوگوں کے
بَشِيرًا وَنَذِيرًا (سبا - ۳) لیے خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔

بہرحال قرآن مجید ہی آپ کے رسول برحق ہونے کی ایک ایسی اٹل شہادت ہے جو قیام قیامت تک قائم رہنے والی ہے۔ خدائے تعالیٰ نے قرآن مجید میں تمام انسانوں کو ببانگ دہل بار بار اس کا چیلنج دیا ہے کہ اگر تم کو اس دلیلِ شہادت پر کوئی شبہ ہے تو اس جیسا کلام بنا کر پیش کرو۔ لیکن ساری دنیا پر سناٹا چھا گیا اور وہی ہوا جس کی پہلے ہی پیشین گوئی کر دی گئی تھی کہ "تم ہرگز ایسا نہ کر سکو گے"۔ یہی باعث ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جب منکروں نے فرمائشی معجزات کا مطالبہ کیا تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے آپ نے ان کو صاف جواب دیدیا کہ تمہارے سامنے یہ کھلی ہوئی کتاب موجود ہے۔ اسکی موجودگی میں اور کس معجزہ کی حاجت باقی رہتی ہے؟

أَفَغَيْرَ اللَّهِ أَبْتَغِي حَكَمًا وَهُوَ پس کیا اب اللہ کے سوا کسی اور کو منصف بناؤں حالانکہ
الَّذِي أَنزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتَابَ مُفَصَّلًا (انعام - ۱۴) تمہاری طرف یہ واضح کتاب اسی نے اتاری ہے؟

یعنی اس کتاب میں انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کے لیے بہترین اصول، قومی و بین الاقوامی مسائل کا عمدہ سے عمدہ حل، دینی و دنیوی ضروریات کے لیے اعلیٰ درجہ کے عقائد و احکام، معاشی و سیاسی اعتبار سے نہایت متوازن اور عالمگیر قوانین موجود ہیں۔ اسکی ایک ایک چیز شہادت دے رہی ہے کہ اس کا مصنف حکمت و دانائی اور کمال بصیرت اور وسعت علم کے اس انتہائی مقام پر ہے جہاں کسی انسان کی نہیں بلکہ بحیثیت مجموعی پوری نوع انسانی کی رسائی بھی نہیں ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ ایسی کتاب کو ایک ایسے شخص پر اتارا گیا ہے جو خود بالکل ہی ان پڑھ اور امی ہے۔ اب اس کے بعد تمہیں اور کس چیز کی ضرورت ہے جو اس کتاب سے زیادہ روشن طریقہ پر تمہیں یہ بتا سکتی ہو کہ اس شخص کو فی الواقع خدائے تعالیٰ ہی نے اپنی پیغمبری کے منصب پر سرفراز فرمایا ہے؟ اسی لیے قرآن مجید میں

ایک مقام پر فرمایا جاتا ہے:

قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَاۤ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (یونس۔۲)

(اے نبی ان سے) کہو کہ اگر اللہ تعالیٰ نے نہ چاہا ہوتا تو میں یہ کتاب نہ تو تمہیں سنا سکتا تھا اور نہ تم کو اسکی خبر دے سکتا تھا۔ کیونکہ آخر اس سے پہلے بھی تو میں تم میں ایک عمر بسر کر چکا ہوں۔ کیا تم اتنا نہیں سوچتے؟

یعنی تمہارے ہی درمیان میں نے اپنی عمر کا ایک کافی حصہ گذارا ہے۔ پورے چالیس برس تم ہی میں بسر کر ڈالے ہیں۔ اس طول طویل زندگی کا ایک ایک گوشہ تمہاری نظروں کے سامنے ہے۔ کیا کبھی چالیسویں سال سے پہلے بھی تم نے میری زبان سے یہ علوم و معارف اور یہ حکمت و دانائی کی باتیں سُنی ہیں؟ کیا کبھی اس سے پہلے بھی میں نے عالم غیب کے متعلق تم سے کوئی بات کی؟ کیا کبھی میں نے اس سے پہلے بھی اقوام قدیمہ کی تاریخ پر کوئی تبصرہ کیا یا پچھلے زمانہ کے انبیاء کا کبھی ذکر کیا؟ کیا اس سے پہلے بھی اخلاق، سیاست، تمدن و معاشرت اور قانون کے مسائل پر تم نے کوئی گفتگو کرتے ہوئے مجھے دیکھا؟ کیا کبھی اس سے پہلے بھی تم نے میری زبان سے قرآن جیسا کلام سُنا جو اپنے مضامین، خیالات، اسلوب بیان، طرز ادا، اور الفاظ و معانی کے اعتبار سے اس قدر انوکھا اور اپنی بے مثل فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے اتنا دل نشین اور اچھوتا ہو؟ اگر نہیں، تو اس امر میں شک و شبہ کی کیا گنجائش ہے کہ یہ کلام بلاغت نظام کسی علیم و حکیم کی طرف سے مجھ پر نازل ہو رہا ہے، میرے اپنے دماغ کی پیداوار نہیں ہے؟ تمہیں معجزہ درکار ہے تو اس سے بڑھ کر اور کیا معجزہ ہو سکتا ہے کہ جو شخص بچپن سے جوانی تک تمہارے سامنے جنگل میں بکریاں چراتا رہا ہے، اور جس نے چرواہے کی زندگی چھوڑنے کے بعد تجارتی کاروبار میں اپنا سارا وقت صرف کیا ہے، اور جس کو دنیوی علوم کی کبھی ہوا بھی نہیں لگی ہے، وہ یکایک تمہارے سامنے وہ بے نظیر کتاب پیش کر دیتا ہے جس کی نظیر ساری دنیا کے علماء مل کر بھی پیش نہیں کر سکتے۔ اسی مضمون کی

طرف اس آیت میں بھی اشارہ فرمایا گیا ہے :۔

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتَابٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ (عنکبوت۔ ۵)

(اے پیغمبر!) اور تم اس سے پہلے نہ کوئی کتاب پڑھتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے۔ (اگر تم نے پہلے ایسا کام کیا ہوتا) تب تو باطل پرست شک میں پڑ بھی سکتے تھے۔

اور ایک دوسری جگہ فرمایا۔

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ ۔ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِنَا وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۔

اور اسی طرح ہم نے تمہاری طرف اپنے حکم سے ایک "روح" بھیجی، تم نہ جانتے تھے (اس سے پہلے) کہ کتاب کیا ہے اور نہ ایمان (جانتے تھے)۔ لیکن ہم نے اس کو ایک نور بنا دیا جس کے ذریعہ سے ہم راستہ دکھاتے ہیں اپنے بندوں میں سے جسکو چاہتے ہیں۔ اور بیشک تم صراط مستقیم کی طرف دعوت دیتے ہو۔

کتب آسمانی توریت و انجیل وغیرہ پر جن لوگوں کی نظر تھی، جو آسمانی کتابوں کے مضامین اور انداز بیان سے واقف تھے، جو خدائی کلام اور انسانی کلام کا فرق سمجھنے میں جوہری کی سی بصیرت رکھتے تھے، اور جن میں حق پسندی و انصاف کا مادہ بھی موجود تھا انہوں نے قرآن کو سن کر صاف طور پر اس بات کا اقرار کیا کہ بلا شبہ یہ خدا کا کلام ہے اور خدا ہی کا ہو سکتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ان کے اس اقرار کا بھی حوالہ دیا گیا ہے :۔

اَوَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ اٰيَةً اَنْ يَّعْلَمَهٗ عُلَمٰۗؤُا بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ ۔

کیا ان کے واسطے یہ بات نشانی نہیں ہے کہ علماء بنی اسرائیل اسکو جانتے ہیں؟

اس پوری بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سورۂ یٰس کے آغاز میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا دعویٰ پیش کرنے سے پہلے قرآن حکیم کی جو قسم کھائی گئی ہے اس سے مقصد در اصل یہ ہے کہ آپ کی نبوت پر

قرآن حکیم ہی بہترین شاہد ہے اور اس دعوے کا سب سے زیادہ قوی ثبوت ہے۔

سورۃ ص | یہ سورۃ بھی مکی ہے۔ حضرت عبد اللہ ابن عباس اور دوسرے صحابہ وتابعین کا یہی بیان ہے اور اس کے علاوہ سورت کا موضوع خود اپنے مضامین اور اسلوب بیان کے لحاظ سے اس کے مکی ہونے پر دلالت کر رہا ہے۔ اس سورت میں یہ بتایا جا رہا ہے کہ پچھلی قوموں کی تباہی وبربادی کا اصلی سبب یہ تھا کہ انہوں نے خدائے تعالیٰ کے بھیجے ہوئے انبیاء ومرسلین کی تکذیب کی اور ان کے پیش کردہ حقائق کا نہ صرف انکار کیا بلکہ ان کا مذاق اڑایا حالانکہ ان کو خدائے قدوس کی درگاہ میں عبودیت ونیازمندی کا سر جھکانا اور بندگی کا اقرار واعتراف کرنا چاہیے تھا پس اگر آج بھی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی قرآنی دعوت کے ساتھ ان منکروں کا یہی معاملہ رہا تو ان لوگوں کی بھی وہی گت بن جائے گی جو ان سے پہلوں کی ہو چکی ہے۔ ان کی خیر اسی میں ہے کہ انکار کے بجائے اقرار، اور جحود کے بجائے انابت الی اللہ اختیار کریں تاکہ ہلاکت و بربادی سے محفوظ رہیں۔ اور اگر ان کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی میں کوئی شک وشبہ ہے تو آپ کے لائے ہوئے خداوندی پیغام (قرآن مجید) پر غور وفکر کے ساتھ تدبر کریں۔ کیونکہ اس سے ان کو بخوبی معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ پند ونصائح اور مواعظ سے لبریز اور حقیقت کو پورے طور پر سمجھا دینے والی کتاب خدا ہی کی طرف سے ہے۔ اسی مناسبت سے سورۃ کی ابتداء میں قرآن مجید کی قسم کھا کر فرمایا جاتا ہے۔

صٓ وَالْقُرْاٰنِ ذِی الذِّکْرِ بَلِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فِیْ عِزَّۃٍ وَّشِقَاقٍ کَمْ اَھْلَکْنَا مِنْ قَبْلِھِمْ مِّنْ قَرْنٍ فَنَادَوْا وَّلَاتَ حِیْنَ مَنَاصٍ وَعَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَھُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْھُمْ وَقَالَ الْکٰفِرُوْنَ ھٰذَا سٰحِرٌ کَذَّابٌ (ص-۱)

اس سمجھانے والے قرآن کی قسم جن لوگوں نے کفر کیا در اصل وہ غرور اور ضد میں مبتلا ہیں۔ ان سے پہلے (ایسی ہی) بہت سی قوموں کو ہم نے ہلاک کر دیا (اور جب انکی ہلاکت کا وقت آیا تو) وہ پکار اٹھے کہ ہائے اب چھٹکارے کا وقت باقی نہ رہا۔ انہوں نے اس بات پر تعجب کیا کہ ان کے پاس ایک ڈرانے والا آیا اور کافروں نے کہہ دیا کہ یہ جادوگر ہے، جھوٹا ہے۔

ان آیات میں قرآن مجید کی قسم اس مناسبت سے کھائی گئی ہے کہ یہ موعظت وبصیرت سے بھری ہوئی کتاب ہے جس میں سب کچھ انسان کی فلاح وبہبود اور اسکی بھلائی ہی کے لیے بیان کیا گیا ہے، اور کوئی ایسی بات اس میں ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتی جو آدمی کو خسران وہلاکت کی طرف لے جانے والی ہو، خود اس حقیقت پر شاہد ہے کہ جو لوگ اسکی ہدایت قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں وہ محض ہٹ دھرمی اور ضد میں مبتلا ہیں، اور اپنی فلاح کا راستہ چھوڑ کر اپنی ہلاکت کا راستہ اختیار کر رہے ہیں۔ ان کے انکار کا اصلی سبب یہ نہیں ہے کہ یہ کتاب راہ راست دکھانے میں قاصر ہے یا اس کا لانے والا اس کلام کی تبلیغ وتبیین اور تعلیم میں کوئی کوتاہی کر رہا ہے۔ بلکہ ان منکروں کے انکار کا اصلی اور حقیقی سبب خود انہیں کے عدم توازن، جاہلانہ غرور، نفس پرستی، اور شخصی یا خاندانی اغراض کی بندگی ہے جبکی وجہ سے ان کی عقلوں پر قدامت پرستی، جہالت اور تعصب کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ اگر یہ لوگ ان جذبات سے پاک ہو کر اس کتاب کو صاف نگاہ سے دیکھیں اور ٹھنڈے دل سے سوچیں تو اس پیغام اور پیغام کی سچائی روشن ہو جائیگی اور صراط مستقیم ان کو نظر آجائیگی۔ ورنہ انہیں جان لینا چاہیے کہ راست روی چھوڑ کر کج روی اختیار کرنے کا انجام بہر حال وہی ہونا ہے جو پچھلی امتوں کا ہو چکا ہے۔ کاش کہ انکی تاریخ ہی ان کے لیے عبرت کی موجب ہو اور یہ لوگ نظر اعتبار سے کام لیں فھل من مدکر؟ (باقی)

مطبوعات

تفسیر سورۂ شمس تالیف علامہ حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ - ترجمہ مولانا امین احسن صاحب اصلاحی - ضخامت ۷۰ صفحات - قیمت ۵ر - مکتبۂ حمیدیہ - سرائے میر (ضلع اعظم گڑھ) -

سورۂ شمس میں اللہ تعالیٰ نے پہلے سورج اور چاند، دن اور رات، آسمان اور زمین کی قسم کھائی ہے، پھر نفس انسانی اور اسکی ساخت اور اس پر فجور و تقویٰ کے الہام کی قسم کھا کر بیان فرمایا ہے کہ جس نے اپنے نفس کو پاک کیا اس نے فلاح پائی اور جس نے اسے آلودہ کیا وہ ناکام رہا۔ اس مضمون کی تفسیر میں بنیادی سوال جو حل طلب ہے، وہ یہ ہے کہ مقسم علیہ اور مقسم بہ میں مناسبت کیا ہے؟ یعنی اس دعوے پر کہ نفس کو پاک کرنے والا فلاح پاتا ہے اور اسے آلودہ کرنے والا ناکام و نامراد رہتا ہے، وہ چیزیں کس طرح دلالت کرتی ہیں جنکی قسم کھائی گئی ہے؟ مصنفِ علام نے اسی سوال کو حل کرنے کی کوشش کی ہے، اور حق یہ ہے کہ وہ اس کوشش میں قدیم مفسرین سے بہت آگے نکل گئے ہیں، لیکن پھر بھی یہ کہنا پڑتا ہے کہ ان کا نشانۂ تحقیق ہدفِ مقصود پر ٹھیک نہیں بیٹھ سکا، صرف قریب پہنچ کر رہ گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مقسم علیہ کے تعین میں ان کو اضطراب پیش آیا ہے، اس لیے وہ انفس و آفاق کی دلالتوں کو براہ راست قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا کے مرکزی معنی تک نہیں لے جاتے بلکہ اس کے لوازم و متعلقات میں سے کبھی ایک طرف اور کبھی دوسری طرف اُن کا رخ پھیر دیتے ہیں۔ یہ بات بادنیٰ تامل سمجھ میں آسکتی ہے کہ یہاں توحید الٰہی اور جزائے اخروی بجائے خود مقسم علیہ نہیں ہیں بلکہ اصل مقسم علیہ کے متعلقات ہیں، اور اصل مقسم علیہ صرف

یہ ہے کہ نفس کو پاک کرنے کا نتیجہ مطلقاً فلاح ہے اور اُسے آلودہ کرنے کا انجام مطلقاً نامرادی۔ لہٰذا تفسیر کا حق ادا کرنے کے لیے لازم تھا کہ اس مرکزی معنی پر اچھی طرح نظر جمادی جاتی اور آفاق و انفس کے جن جن آثار کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ان سب کی دلالتوں کو ٹھیک اس مرکز تک پہنچایا جاتا۔

مصنف سے ایک لغزش یہ بھی ہوئی ہے کہ انہوں نے سورہ کے عمود کو محدود کر دیا ہے۔ انکے نزدیک "اس سورہ میں قریش اور ان کے بدبخت سردار کے لیے انذار و تخویف ہے"، اور "روئے سخن بصورت خصوصیت کے ساتھ ابولہب کی طرف ہے"۔ حالانکہ دراصل اس سورہ میں ایک عالمگیر کلیہ بیان کیا گیا ہے جو انسان پر عین اسکی ساخت اور اسکی خلقت کے لحاظ سے راست آتا ہے، اور بلا قید زمان و مکان ہر شخص اور ہر قوم کے حق میں ویسا ہی صحیح ہے جیسا ابولہب اور قریش کے حق میں تھا۔ یہ تو کلی اور اصولی حقیقتیں ہیں جو حال و مقام کی محدودیتوں سے آزاد ہوتی ہیں۔ البتہ قرآن چونکہ ایک خاص وقت اور خاص قوم میں نازل ہوا ہے، اور اس کے اولین مخاطب وہ خاص لوگ تھے جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے، لہٰذا اس نے ان عالمگیر حقیقتوں کو اس انداز میں بیان کیا ہے کہ یہ اُس محل خاص پر بھی چسپاں ہوتی ہیں جو نزول کے وقت سامنے موجود تھا، اور پھر بجائے خود عالمگیر کی عالمگیر بھی رہتی ہیں۔ ایسے مواقع پر مناسب تر یہ ہے کہ پہلے سورہ کے عمود کو اسکی پوری وسعتوں کے ساتھ بیان کیا جائے اور پھر اس کے محل خاص کی طرف بھی اشارہ کر دیا جائے۔

ان امور کا ذکر صرف اس لیے کیا گیا ہے کہ ناظرین ان کو ملحوظ رکھ کر مصنف کی تحقیق سے فائدہ اٹھا سکیں۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ کتاب کا ہر صفحہ اعلیٰ درجہ کی تحقیق سے لبریز ہے اور قرآن مجید کے معانی میں غور و خوض کرنے والوں کو تدبر کی نئی نئی راہیں دکھاتا ہے۔ آثار فطرت اور تاریخ سے قرآن کے استدلال کو علامہ مرحوم جس بالغ نظری کے ساتھ کھول کھول کر واضح کرتے ہیں، اور اس کے ضمن میں جیسے جیسے لطیف نکات بیان کرتے ہیں، وہ ان کا خاص حصہ ہے وذٰلك فضل الله يؤتيه من يشاء۔

ہندوستان میں قانون شریعت کے نفاذ کا مسئلہ | مولوی سید عقیل محمد صاحب بی۔ ایس۔سی۔ ایل ایل۔بی۔ قیمت ۳ر ندوۃ المصنفین، دہلی۔

یہ مختصر رسالہ ایک ایسے مسئلہ سے بحث کرتا ہے جو ہندوستان میں مسلمانوں کی حیات ملی کے لیے سب سے زیادہ اہم ہے اور مسلمان سب سے زیادہ اس سے غافل ہیں۔ ہندوستان میں کروڑوں مسلمانوں کے موجود ہوتے ہوئے آخر کس طرح یہ انقلاب رونما ہو گیا کہ جہاں، معیشت، اور معاشرت اور نظم مملکت کے سارے معاملات اسلامی قانون کے مطابق چل رہے تھے وہاں چند مسائل نکاح و طلاق و وراثت وغیرہ کے سوا تمدنی زندگی کے تمام امور اس قانون کی گرفت سے نکل گئے؟ پھر اس انقلاب سے خود ہمارے اخلاق، ایمان اور تہذیب و تمدن پر کتنے دور رس نتائج مترتب ہوئے؟ اور کس طرح ہمارے ان مخصوص اور محدود شرعی مسائل میں بھی، جن کو پرسنل لا سے تعبیر کیا جاتا ہے، انگریزی تخیل نے تدریجی مداخلت کی یہاں تک کہ رفتہ رفتہ شریعت محمدیہ کے بجائے انگریزی عدالتوں کا بنایا ہوا "اینگلو محمڈن لا" ہمارے نکاح و طلاق تک کے معاملات پر مسلط ہو گیا؟ یہ وہ مسائل ہیں کہ اگر ہم میں کوئی حقیقی بیداری پیدا ہوئی ہوتی تو اب تک ان پر تحقیقات کے انبار لگ گئے ہوتے، اور ہماری تمام سیاسی جد و جہد کا رخ اس طرف پھر جاتا کہ سب سے پہلے ہم اپنی اجتماعی زندگی پر خود اپنے شرعی قانون کے نفاذ و اجراء کا حق حاصل کریں۔ فاضل مولف نے اس رسالہ میں انہی امور پر مختصر اور سرسری بحث کی ہے۔ انہوں نے پہلے یہ دکھایا ہے کہ انگریزی عدالتوں کا "محمڈن لا" کس طرح پیدا ہوا اور کس طرح اس نے اسلامی شریعت کو مسخ کیا۔ پھر ان ناقص اور جزوی تدابیر کے نقصانات واضح کیے ہیں جو حال میں شریعت بل اور خلع بل وغیرہ کی صورت میں کی گئی ہیں۔ آخر میں اس امر پر زور دیا ہے کہ ہندوستان میں کم سے کم جو چیز ہماری مشکلات کو حل کر سکتی ہے وہ ایک اسلامی دار القضاء کا قیام ہی ہے، خواہ وہ ابتداءً محدود پیمانہ ہی پر کیوں نہ ہو

اس سلسلہ میں وہ موجودہ دستوری حالات کے اندر قیام دار القضاء کے امکانات دکھانے کی کوشش کرتے ہیں اور فصل خصومات کے ساتھ ساتھ اوقاف کے انتظام، مکاتب اسلامی کی نگرانی، معاشرتی اور اخلاقی جرائم کے انسداد اور بیت المال کے قیام کو بھی دار القضاء سے متعلق کرنے کی تجویز پیش کرتے ہیں۔ ان امور میں اگرچہ بہت کچھ کلام کی گنجائش ہے تاہم یہی غنیمت ہے کہ اب مسلمانوں کے تعلیم یافتہ لوگ سنجیدگی کے ساتھ اس پہلو پر غور کرنے لگے ہیں۔ آگے بڑھ کر توقع ہے کہ یہ بات بھی لوگوں کی سمجھ میں آنے لگے گی کہ جس طرز کا دستوری ڈھانچہ اس وقت بنا ہوا ہے یا آئندہ بنتا نظر آرہا ہے اس میں اسلامی تخیل کے مطابق کسی تنظیم کی ادھوری شکل بھی بننی ممکن نہیں ہے، اور یہ کہ اگر ہم اپنے سے مسلمان کی سی زندگی چاہتے ہیں تو ہمیں لامحالہ انقلابی حرکت کرنی پڑیگی

تحریک مدح صحابہ | مولوی مظہر علی اظہر صاحب ایم۔ ایل۔ اے جنرل سیکرٹری مجلس احرار ہند قیمت مجلد ۱۲ار۔ بلا جلد ۱۰ار۔ مکتبۂ اردو۔ لاہور۔

یہ مختصر کتاب اقتضائے وقت کے اعتبار سے نہایت مفید ہے اور عوام کے اس خیال کی تردید کرتی ہے کہ تحریک مدح صحابہ گذشتہ تین چار سال ہی سے عالم وجود میں آئی ہے۔ فاضل مصنف خود ایک مقتدر شیعہ ہیں جنہوں نے ایک سچے مومن کی طرح بے لاگ صاف گوئی سے کام لے کر اس تحریک کے آغاز کا سراغ لگایا ہے اور اس کے مالۂ و ما علیہ پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اُن کے نزدیک لکھنؤ کے شیعوں اور سُنیوں کے مابین اس فتنہ و فساد کی بنا ۱۹۰۵ء میں ڈالی گئی اور اسکی وجہ خصوصاً یہ پابندی کہ سُنی احاطۂ درگاہ میں سر سے ٹوپی اتار کر اور ننگے پیروں جایا کریں اختلافات کی خلیج کو زیادہ وسیع کرنے کا باعث ہوئی، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۹۰۶ء اور ۱۹۰۸ء میں شیعوں اور سُنیوں کے مابین ایک زبردست تصادم ہوا۔ بیسیوں آدمی قتل ہوئے اور سینکڑوں سزایاب۔ حکومت نے تحقیقات کے بعد جو فیصلہ دیا اگرچہ شیعوں کی اس میں

بڑی کامیابی تھی لیکن اپنی ہٹ دھرمی سے انہوں نے اس کامیابی کو شکست سے بدل دیا۔

مدح صحابہ کے خلاف فاضل مصنف نے شیعوں کے فعل تبرّا کو ناجائز گردانتے ہوئے سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور ائمہ اہل بیت رحمہم اللہ اجمعین کے اسوۂ حسنہ اور طرز عمل کو بطور سند پیش کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ اس زمانہ کے شیعہ اپنے بزرگوں کے مسلک کے خلاف چل کر اُن کے دین کو علانیہ داغ لگا رہے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ جناب امیر نے تو اس تنگ نظری اور کور ذہنی کے خطرہ کے پیش نظر اپنی اولاد کے نام ابو بکر، عمر اور عثمان رکھدیے تھے، مگر شیعوں نے اس تبرّا کی تحریک کو مذہبی جامہ پہنا رکھا ہے۔ فاضل مصنف کے یہ الفاظ ہر شیعہ کو غور سے پڑھنے چاہییں۔

"اس تحریک میں مذہب کو کوئی دخل نہیں۔ مذہب میں اس کا جواز تلاش کرنا ایک بے سود کوشش ہے۔ صاحب خلق عظیم کا مذہب اور صاحبِ مکارِم اخلاق ائمہ کا دین ایسے شر رکوش اور فتنہ انگیز مظاہروں کی اجازت نہیں دے سکتا۔ جناب علی مرتضیٰ نے اپنے دورِ حکومت میں ایسی بیہودگی کا مظاہرہ نہیں کیا اور نہ جناب امام حسن علیہ السلام نے اپنی چھ ماہ کی حکومت میں اس قسم کی باتیں کیں یا کرنے کو کہا۔

"دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے اور اُن کے بعد اُسوہ جناب امیر اور ائمۂ معصومین علیہم السلام کا ہے۔ لکھنو کے شیعہ اور ان کے ساتھ ہندوستان کے شیعہ ایک سرسامی کیفیت میں مبتلا ہو کر مجنونانہ حرکات کا ارتکاب کر رہے ہیں اور جتنی جلدی وہ ہوش میں آجائیں، اتنا ہی اچھا ہے"

اس تصریح کے بعد اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مدح صحابہ کے معاملہ میں شیعوں نے کتنی کجروی اختیار کی ہے اور مذہب کے نام پر جو ناشائستہ حرکات کی گئی ہیں اور کی جارہی ہیں انہیں درحقیقت مذہب اہل تشیع سے دور کا بھی واسطہ نہیں بلکہ اُن کی یہ روش مسلمانوں کے رہے

ہے وقار کے لیے ضرب کاری کا حکم رکھتی ہے۔

فاضل مصنف آگے چل کر کہتے ہیں۔

"جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ہندوستان اور بیرون ہند میں مسلمانوں کی سربلندی اور ترقی کے لیے اور اغیار کے پنجے سے بچنے کے لیے اتحاد کی ضرورت ہے اُنہیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ مسلمانوں کی جو جماعتیں حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کی تعریف کے معمولی فقرات بھی برداشت نہیں کر سکتیں اور جنکی ذہنیت اس بارے میں کسی مصالحت اور مفاہمت کی روا دار نہیں اُن کے ساتھ ہو کر یا انکو ساتھ لے کر اغیار کے ساتھ کوئی مقابلہ نہیں کیا جا سکتا اور کوئی میدان سر نہیں ہو سکتا۔

"جو لوگ تبرّا بازی کو مذہب قرار دیں اور اُن ناپسندیدہ اور شر انگیز مظاہروں کو جزو دین بتائیں جو لکھنؤ میں کیے جا رہے ہیں وہ اور ان کی رفاقت اِس قابل نہیں ہو سکتی کہ گرانقدر خدمت اسلامی کا کوئی کام اُن سے سرانجام ہو۔

"اگر فی الحقیقت اسلامی یکجہتی اور ترقی کی خواہش ہو تو شیعوں سے تبرّا کی ذہنیت کے ترک کرنے کا مطالبہ کرنا پڑے گا۔"

کتاب کے مندرجہ بالا اقتباسات اسکی قدر و قیمت کو پہچاننے کے لیے کافی ہیں۔ ہمارے خیال میں لکھنؤ کے شیعوں کے ہر گھر میں اس کتاب کا موجود ہونا ضروری ہے اور مطالعہ کے بعد انہیں اپنے کیے پر پچھتانا چاہیے مولٰینا مظہر علی اظہر نے اس کتاب کے ذریعہ سے ایک بہت بڑی خدمت سرانجام دی ہے۔ کاش شیعہ بھائی اس سے استفادہ کریں۔

دردِ دل یہ خواجہ دل محمد صاحب ایم۔ اے پرنسپل اسلامیہ کالج لاہور کی قومی و ملّی نظموں کا مجموعہ ہے۔ انجمن حمایت اسلام لاہور کے جلسوں میں شرکت کرنے والوں کو اس کا بخوبی اندازہ ہے کہ خواجہ صاحب

موصوف کی نظم ہر سال کتنے ذوق وشوق سے سُنی جاتی ہے - آپ اسلامی درد رکھنے والے ایک کہنہ مشق شاعر ہیں - اس مجموعہ میں قریب قریب وہ تمام نظمیں جمع کردی گئیں ہیں جو آپ وقتاً فوقتاً مختلف مجالس میں پڑھتے رہے ہیں - کاغذ، لکھائی اور چھپائی دیدہ زیب ہے - کتاب مجلد ہے قیمت ایک روپیہ - انجمن حمایت اسلام لاہور سے مل سکتی ہے -

ایمان درس قرآن نمبر یہ سلسلہ مرکزی سیرت کمیٹی پٹی - ضلع لاہور کی جانب سے شروع کیا گیا ہے جسکا مقصد یہ ہے کہ قرآن مجید کا ترجمہ سلیس اور عام فہم زبان میں عوام تک پہونچایا جائے اور اسکے معارف بھی اس طرح بیان کیے جائیں کہ پڑھتے ہی ہر ایک کے دلنشین ہو جائیں - بلاشبہ یہ ایک مفید خدمت ہے - چندہ سالانہ درجہ اول ایک روپیہ اور درجہ دوم آٹھ آنہ - ملنے کا پتہ : قاضی عبدالمجید قریشی سیکرٹری سیرت کمیٹی پٹی، ضلع لاہور

انبیا کے دو دشمن اس مختصر پمفلٹ میں یہ بتایا گیا ہے کہ حکام وقت اور سرمایہ دار ہر زمانہ میں انبیا علیہم السلام کے دشمن رہے ہیں اور جب قوم پر بھی خدا کی طرف سے کوئی قہر نازل ہوا اس کا باعث انہی دو گروہوں کی بداعمالیاں ہوئی ہیں - انہوں نے نہ صرف خود انبیا سے دشمنی کی بلکہ اپنے اثر واقتدار سے کام لیکر عوام کے دلوں کو بھی احکام الٰہی سے منحرف کردیا - مصنف نے اس کے ثبوت میں قرآن مجید سے جابجا استسناد کیا ہے اور حضرت نوحؑ سے لے کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیا کی مطہر زندگیوں سے جستہ جستہ مثالیں پیش کی ہیں - قیمت ۴؍ مکتبۂ اسلامیہ اندرون موچی دروازہ لاہور

ہندوستانی کیا ہے سید مہدی حسین صاحب (عثمانیہ) قیمت ۱؍ - بزم ادب - عثمان شاہی شمس منزل - حیدرآباد دکن -

اردو، ہندی یا ہندوستانی زبان کا جو جھگڑا اس وقت ہندوستان کے مقتدر اصحاب کے دماغوں کو پریشان کر رہا ہے، اس پہ تبصرہ کرتے ہوئے صاحب مقالہ نے یہ خیال ظاہر کیا ہے

کہ اگر زبان کو افادی حیثیت سے کوئی نقصان نہ پہنچے تو نام کے جھگڑے میں پڑنے کی چنداں ضرورت معلوم نہیں ہوتی اور لفظ ہندوستانی اس کے لیے موزوں ترین نام ہے۔

جامع الآداب | مولوی عبد الرحیم صاحب مولوی فاضل و منشی فاضل۔ قیمت مجلد ۱۲/ ۔ غیر مجلد
قومی کتب خانہ۔ ریلوے روڈ۔ لاہور

یہ عربی کتاب آداب الفتیٰ کا ترجمہ ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ طالب علموں کو شائستہ آداب و اخلاق کے زیور سے آراستہ کیا جائے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ اس زمانہ میں جہاں تعلیمی نصاب بدل گیا ہے تعلیمی نصب العین بھی اگلے وقتوں سے بہت مختلف ہے اور اخلاق و آداب کی تو وہ مٹی پلید ہوئی ہے کہ استغفر اللہ۔ اگر جامع الآداب ایسی کتابوں کی عام اشاعت تو بہتر ہے۔ جہاں تک اس کے نفسِ مضمون کا تعلق ہے کتاب مذکور میں اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں۔ لیکن ترجمہ میں الفاظ کی ثقالت طالب علموں کے لیے یقیناً حوصلہ شکن ہوگی۔ اگر فاضل مترجم تطہیر، تنظیف، فقر الدم، کابوس، مشروبات وغیرہ وغیرہ الفاظ استعمال نہ کرتے تو بہتر ہوتا۔ اُن کے بجائے عام فہم اور آسان لفظ زبان میں مل سکتے ہیں امید ہے کہ جب یہ کتاب دوسری بار شائع کی جائیگی تو اس نقص کو رفع کرنے کی جانب ضرور توجہ دیجائیگی۔

مدیر ترجمان القرآن کا تازہ مقالہ "اسلام کا نظریہ سیاسی"

انگریزی زبان میں طبع کرایا گیا ہے۔ مقصود یہ ہے کہ مسلمانوں کی مختلف سیاسی اور مذہبی جماعتوں میں اس وقت جو تصادم ہو رہا ہے اُس کو دور کیا جائے اور وہ صرف اس طرح ہو سکتا ہے کہ ان تمام جماعتوں کے سامنے اسلام کے نظریۂ سیاسی کا صحیح صحیح تصور پیدا ہو جائے۔ امید ہے کہ اس مقالہ کی اشاعت بہت حد تک اس مقصد میں کارآمد ثابت ہوگی۔ چاہیے کہ ذی استطاعت حضرات اس مقالہ کو کثیر تعداد میں خرید کر اپنے اپنے حلقوں میں مفت تقسیم کریں۔

قیمت ایک عدد ۲/ مع محصول ڈاک

" ۵ " ۸/ "

" ۲۵ " ۲/۴ "

تنقیحات کے بعد تفہیمات

تفہیمات کے نام سے مدیر ترجمان القرآن کے بعض معرکۃ الآرا مضامین کا ایک مجموعہ شائع ہو رہا ہے۔ جو اس رسالہ کے سائز کے ۴۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ قیمت بے جلد کے لیے ایک روپیہ آٹھ آنے اور مجلد کے لیے دو روپے رکھی گئی ہے کتاب ابھی مطبع میں ہے۔ جو حضرات فرمائشیں ابھی سے درج رجسٹر کرا دینگے انکے نام کتاب مطبع سے آنے کے بعد فوراً روانہ کر دی جائیگی۔

ملنے کا پتہ: دفتر رسالہ ترجمان القرآن لاہور۔

مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش

حصہ اوّل

اِسلامی ہند کی گذشتہ تاریخ، موجودہ حالت اور مستقبل کے امکانات پر ایک سبق آموز تبصرہ جس سے مسلمانانِ ہند کے قومی مسئلہ کا ایک نیا تصوّر پیدا ہوتا ہے۔ اِس کتاب کو زیادہ سے زیادہ پھیلانے کی ضرورت ہے۔ اسلئے قیمت بہت کم رکھی گئی ہے

حصہ دوم

اِس حصہ میں ہندوستان کے موجودہ سیاسی حالات پر مفصل تبصرہ کر کے بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کی غفلت سے اِس وقت تک مُلک کے سیاسی تغیرات کس طرح اصول اسلام اور مسلمانوں کے قومی مفاد کے خلاف ہوتے رہے ہیں اور یہ کہ اگر اب مسلمان اپنی قومی زندگی کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو انہیں کونسی پالیسی اختیار کرنی چاہیے۔ اِس کی قیمت بھی اشاعت عام کے لئے بہت کم رکھی گئی ہے۔

حصہ سوم

مسلمانوں کی موجودہ سیاسی کشمکش کا عملی حل کیا ہے۔ اسلامی حکومت کن اصولوں پر قائم کی جا سکتی ہے۔ ایسا اقدام کرنے والے گروہ کو کن اصولوں پر منظم کیا جا سکتا ہے، اور ان اصولوں پر جس قدر اعتراضات و شبہات کئے جا سکتے ہیں، ان کا جواب کیا ہے۔ یہ تمام باتیں اس حصہ میں شرح و بسط کے ساتھ بیان کر دی گئی ہیں۔

قیمت حصہ اول	حصہ دوم	حصہ سوم	محصول ڈاک
آٹھ آنے فی جلد	ایک روپیہ آٹھ آنے	ایک روپیہ چار آنے	تین آنے

دفتر رسالہ ترجمان القرآن دار الاسلام، پٹھانکوٹ، (پنجاب)

مدیر ترجمان القرآن کی تالیفات

الجہاد فی الاسلام مختصر فہرست مضامین حسب ذیل ہے :-

۱- اسلامی جہاد کی حقیقت ، ہمیں بتایا گیا ہے کہ قرآن کی تعلیم جہاد کن اہم حقائق پر مبنی ہے اور نظام تمدن میں روح جہاد کا کیا مرتبہ ہے

۲- مدافعانہ جنگ وہ اغراض جن کے لئے قرآن نے دفاعی جنگ کا حکم دیا ہے۔

۳- مصلحانہ جنگ اصلاحی جنگ کے اصول و مقاصد کی تشریح اور ان اعتراضات کا جواب جو اس نوع کی جنگ پر کیے جاتے ہیں

۴- اشاعت اسلام اور تلوار۔ دعوت و تبلیغ کے متعلق اصول تعلیم اسلامی کی تشریح اور اس امر کی تحقیق کہ اشاعت اسلام میں تلوار کا کیا حصّہ ہے۔

۵- قوانین جنگ اسلام سے قبل کے وحشیانہ طریقہائے جنگ اور ان میں اسلام کی اصلاحات۔

۶- جنگ دوسرے مذاہب میں۔ جنگ کے متعلق ہندو مذہب، بودھ مت، یہودیت اور مسیحیت کی تعلیمات پر مفصل تبصرہ۔

۷- جنگ اور تہذیب جدید- بین الاقوامی قانون جنگ کی تفصیل اور اسلامی قانون سے اسکا مقابلہ۔ قیمت مجلد ۵ غیر مجلد ۴

رسالہ دینیات یہ رسالہ ہائی اسکول کی آخری جماعتوں میں تعلیم پانے والے لڑکوں اور لڑکیوں کیلئے لکھا گیا ہے۔ اس میں تعلیم دینیات کا بالکل جدید طرز اختیار کیا گیا ہے۔ مسلمان نوجوانوں کو کالج کی منزل میں داخل ہونے سے پہلے یہ رسالہ پڑھا دینا نہایت ضروری ہے۔ اسمیں بہترین عقلی دلائل کے ساتھ اسلام کی بنیادی تعلیمات اور اصول شریعت کو سمجھایا گیا ہے اور ان شبہات کو رفع کیا گیا ہے جو زمانۂ جدید کے دماغوں میں عموماً پیدا ہوتے ہیں۔

طلبہ کے علاوہ عام ناظرین اور خصوصاً جدید تعلیم یافتہ حضرات کے لیے بھی اس رسالہ کا مطالعہ فائدہ سے خالی نہیں نیز علماء بھی اس سے مستفید ہو سکتے ہیں کیونکہ یہ رسالہ انکو بتائیگا کہ اس دور میں اسلام کو پیش کرنیکا صحیح طریقہ کیا ہے۔

قیمت ۱۰ / محصولڈاک ۲ / خرچ وی پی ۳ /

دفتر ترجمان القرآن لاہور سے طلب کیجئے

سوہن و تصاویر پرنٹ پریس بل روڈ لاہور میں طبع ہوئے